ہجرت، سرحد اور عورت:
آنند لہر کے فکشن کا مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل

مقالہ نگار

سوشیل کمار

نگراں

پروفیسر مظہر حسین

(مظہر مہدی)

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لنگویجز، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-110067

2017

जवाहरलाल नेहरू विश्वविद्यालय
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
भारतीय भाषा केन्द्र
Centre of Indian Language
भाषा, साहित्य एवं संस्कृति अध्ययन संस्थान
School of Langauge, Literature & Culture Studies
नई दिल्ली–110067, भारत NEW DELHI-110067, INDIA

Dated: 20 /06/2017

DECLARATION

I hereby declare that the research work done in this M.Phil Dissertation entitled *Hijrat, Sarhad aur Aurat: Anand Lahar ke Fiction ka Mutal'a: (Migration, Border and Women: A Study of Anand Lahar's Fiction)* by me is an original research work and it has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/ Institution.

Sushil Kumar
(Research Scholar)

Prof. Mazhar Hussain
(Mazhar Mehdi)
(Supervisor)
CIL/SLL&CS/JNU

Prof. Gobind Prasad
(Chairperson)
CIL/SLL&CS/JNU

GRAM: JAYENU, Tel.: (91-011) 26741557, 26742676 Extn.: 4217, (D) 26704217; Email: chair_cil@mail.jnu.ac.in

انتساب

اپنے والدین کے نام

مشمـــولات

پیش لفظ 4-6

باب اول: آنند لہر کی حالات زندگی اور ادبی خدمات

(الف) حالات زندگی 8-10

(ب) ادبی خدمات 11-18

باب دوم: جموں وکشمیر میں افسانہ نگار اور آنند لہر بحیثیت افسانہ نگار

(الف) جموں وکشمیر میں افسانہ نگاری: ایک مختصر جائزہ 20-41

(ب) آنند لہر کی افسانہ نگاری: ایک تفصیلی جائزہ 42-65

باب سوم: ہجرت، سرحد اور عورت: آنند لہر کے فکشن کا مطالعہ

(الف) آنند لہر کے فکشن میں ہجرت 67-91

(ب) آنند لہر کے فکشن میں سرحد 92-104

(ج) آنند لہر کے فکشن میں عورت 105-114

باب چہارم:

آنند لہر کے فکشن میں دیگر موضوعات: مجموعی جائزہ 115-124

حاصل مطالعہ 125-129

کتابیات 130-133

پیش لفظ

ریاست جموں وکشمیر کا فطری، تہذیبی اور تاریخی اعتبار سے ایک منفرد مقام ہے۔ اردو وہاں کی نہ صرف سرکاری زبان ہے بلکہ ریاست کے الگ الگ خطوں میں رہنے والے لوگوں کی ترسیلی زبان بھی ہے۔ ادیبوں اور فنکاروں نے مختلف سماجی، سیاسی مسائل کو نظم ونثر کی شکل میں اپنی تخلیقات کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اگر چہ ریاست کے فنکار شاعری کی طرف متوجہ ہوئے لیکن فکشن نگاروں کی بھی کمی نہیں۔ پریم ناتھ پردیسی کے علاوہ ٹھاکر پونچھی، کرشن چندر سے لے کر آج تک متعدد فنکاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو فکشن نگاری کو فروغ دیا ہے۔ انھوں نے متعدد افسانے، ناول اور ڈرامے تخلیق کیے ہیں۔ انھی افسانہ نگاروں میں آنند لہر ایک اہم نام ہے۔

آنند لہر کا شمار عصر حاضر میں ریاست کے نامور فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے افسانے، ناول اور ڈرامے تخلیق کیے ہیں جس میں انھوں نے مختلف موضوعات ومسائل کو بے باکی سے پیش کیا ہے۔ پیشے سے وہ وکیل ہیں، جہاں ان کی ملاقات نہ صرف مختلف ذہنیت کے لوگوں سے ہوتی ہے بلکہ دوران وکالت وہ سماج کے مختلف مسائل سے بھی آشنا ہوتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے مختلف سماجی مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ ان کی کہانیاں زندگی میں رونما ہونے والے ہر چھوٹے بڑے واقعات اور ان مسائل کے وجوہات کو بیان کرتی ہیں۔

جب مجھے آنند لہر کے فکشن کا علم ہوا تو میں نے ان کے تمام افسانے، ناول اور ڈراموں کے مجموعے حاصل کیے۔ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد موضوعات کی نشاندہی کی اور اپنے شفیق استاد محترم پروفیسر مظہر مہدی

حسین کے مشورے سے ایم۔فل کے تحقیقی موضوع کا انتخاب کیا۔

میرے اس تحقیقی مقالے کا عنوان ''ہجرت، سرحد اور عورت: آنند لہر کے فکشن کا مطالعہ'' ہے۔ میں نے اس مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب ''آنند لہر کی حالات زندگی اور ادبی خدمات'' کے تحت میں نے آنند لہر کے احوال و کوائف اور ان کی ادبی خدمات، آباواجداد، خاندان اور موجودہ صورتحال پر روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تخلیقات پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے ان کی اشاعت اور مرکزی خیال کو پیش کیا ہے اور ان کی خدمات کے پیش نظر جن حضرات اور اداروں نے ان کی حوصلہ افزائی اور انھیں انعامات سے نوازا ہے ان سبھی کا ذکر کیا ہے۔

باب دوم ''جموں و کشمیر میں افسانہ نگار اور آنند لہر بحیثیت افسانہ نگار'' جسے دو ذیلی عناوین کے تحت تقسیم کیا ہے۔ (الف) جموں کشمیر میں افسانہ نگاری ایک مختصر جائزہ؛ (ب) آنند لہر کی افسانہ نگاری ایک تفصیلی جائزہ۔

'الف' میں جموں کشمیر کے افسانہ نگاروں کا ایک مجموعی جائزہ لیا ہے جس میں وہاں کے فنکاروں کے مختلف ادوار اور مختلف موضوعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ 'ب' میں آنند لہر کی افسانہ نگاری کا تفصیلی جائزہ لینے کی سعیٔ کی گئی ہے۔ اس دوران، ان کے پانچوں افسانوی مجموعے زیر نظر رہے ہیں اور ان کے مختلف موضوعات و اطوار کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم ''ہجرت، سرحد اور عورت: آنند لہر کے فکشن کا مطالعہ'' ہے جس کو تین ذیلی عناوین میں تقسیم کیا گیا ہے: (الف) آنند لہر کے فکشن میں ہجرت؛ (ب) آنند لہر کے فکشن میں سرحد؛ (ج) آنند لہر کے فکشن میں عورت۔

'الف' میں ہجرت کا تاریخی پس منظر اور اس کے بعد اردو فکشن میں ہجرت کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے آنند لہر کے فکشن میں ہجرت کے موضوعات کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کا جائزہ لیا ہے اور ہجرت کے پہلو کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'ب' کے تحت میں نے آنند لہر کے فکشن میں موجود سرحد کے مسائل و موضوعات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جن مسائل سے وہاں کی عوام دوچار ہے۔ 'ج' کے تحت میں نے آنند لہر کے فکشن میں عورت کے تعلق سے جو موضوعات ملتے ہیں ان کا جائزہ لیا ہے اور آنند لہر کے فکشن میں عورتوں کے مختلف مسائل

اوران کے الگ الگ پہلوؤں کواجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

باب چہارم ''آنندلہر کے فکشن میں دیگر موضوعات'' کا مجموعی جائزہ، جس میں آنندلہر کے فکشن میں دیگر سماجی، سیاسی مسائل اور موضوعات کی نشاندہی کر کے ان کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

اس مقالے کے مواد کی فراہمی سے لے کر اس کی تکمیل تک جن حضرات کا تعاون رہا میں ان کا تہہ دل سے گزار ہوں۔ سب سے پہلے میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جو مہربان ہے۔ اس کے بعد میں اپنے والدین کا شکر گزار ہوں جن کی وجہ سے میرا وجود ہے اور جن کی نیک دعائیں اور نیک مشورے ہمیشہ میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ میرے گائڈ پروفیسر مظہر حسین مہدی کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے دوران تحقیق مجھے مفید مشوروں سے نوازا اور ہر قدم پر میری رہنمائی اور ان کے علاوہ اپنے سینٹر کے دیگر اساتذہ کرام کا بھی بے حد ممنون و مشکور ہوں۔

میں اپنے تمام احباب بالخصوص امتیاز احمد، روی کانت، سنیل کمار، راکیش کمار اور شاہ نواز قمر کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو مجھے تحقیق کے دوران مفید مشورے دیتے رہے۔

میں جناب ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا مشکور ہوں جنھوں نے تحقیق کے شروعاتی دور میں میری مدد کی۔ ان کے علاوہ آنندلہر کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مواد کی فراہمی میری مدد کی۔

سوشیل کمار

119/ چندر بھاگا ہاسٹل

جے این یو۔ 110067

باب اول

آنند لہر کی حالات زندگی اور ادبی خدمات

(الف) حالات زندگی

(ب) ادبی خدمات

(الف)

حالات زندگی

آنند لہر کا اصل نام شیام سندر اور لہر تخلص استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ادبی دنیا میں آنند لہر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ آنند لہر کی پیدائش 2/جولائی 1951ء کو ریاست جموں و کشمیر کے ضلع پونچھ میں ہوئی۔ ان کے آباو اجداد کا تعلق ضلع پونچھ کے ایک گاؤں جس کا نام سیٹھڑا جواب پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں ہے سے تھا۔ 1947 کے ہنگاموں کے دوران ان کے خاندان کو ہجرت کر کے وہاں سے پونچھ آنا پڑا اور وہی ایک محلّہ سرائے میں رہائش پذیر ہوئے۔

آنند لہر کے دادا جناب لالہ موہن راج آنند اور ان کی دادی رام پیاری جن کا پیشہ کھیتی باڑی تھا اور اسی سے اپنی روزمرہ کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے بلراج آنند، ارجن دیو آنند، ٹھیمو آنند اور لال موہن راج آنند۔

آنند لہر کے والد کا نام بلراج آنند تھا اور والدہ کا نام سمتری دیوی تھا۔ بلراج آنند تعلیم یافتہ اور ذہین تھے اور محکمہ مال کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ آنند لہر کے چچا ارجن دیو آنند پنجابی کے شاعر، لال موہن راج آنند گرداور اور ٹھیمو آنند کا پیشہ کھیتی باڑی کا تھا۔ ان کا کنبہ محنت کش اور خوشحال تھا اور یہ سب ان کی محنت کا نتیجہ تھا۔

آنند لہر کا بڑا بھائی شیورتن آنند تھا، جس نے علی گڑھ سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی لیکن بدقسمتی سے 24 سال کی عمر میں ان کی وفات ہوگئی۔ ان کے چھوٹے بھائی کا نام شیتل کمار آنند ہے جو محکمہ مال میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہیں۔ آنند لہر کی دو بہنیں بڑی رشمی آنند اور چھوٹی ببلی۔ چھوٹی بہن دو سال کی عمر وفات پائی اور بڑی بہن پڑھی لکھی اور پرائیویٹ اسکول میں پڑھانے کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

آنند لہر کی بیوی کا نام نیلم آنند ہے۔ وہ ایک پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہلے وہ بینک میں ملازمت کرتی تھیں مگر گھریلو مصروفیات کی وجہ سے انھوں نے نوکری چھوڑ دی۔

آنند لہر کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بڑا اکشے کمار جس نے جموں یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی اور بعد میں جموں ہائی کورٹ میں وکالت کا اپیشہ اختیار کیا لیکن 18 جنوری 2011ء کو ان کی وفات ہوگئی۔ آنند لہر کا چھوٹا بیٹا سدارتھ آنند انجینئرنگ کا طالب اور اسی پیشے میں مصروف ہیں۔ ان کی چھوٹی بیٹی روہنی آنند نے جموں یونیورسٹی سے ایم۔ایس۔سی کی ہے۔

آنند لہر کی ابتدائی تعلیم کا آغاز پانچ سال کی عمر میں گورنمنٹ پرائمری اسکول پونچھ سے ہوا۔ اور پھر مڈل اسکول پونچھ سے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ہائیر سکینڈری پونچھ سے بارہویں جماعت کا امتحان سائنس کے مضامین میں امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ 1972ء میں ڈگری کالج پونچھ سے بی۔ایس۔سی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی اور جموں ہائی کورٹ میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اس کے بعد انھوں نے عدلیہ اعلیٰ یعنی سپریم کورٹ آف انڈیا میں بطور سینئر ایڈوکیٹ اپنا فریضہ انجام دینے لگے۔ اس وقت آنند لہر کا شمار ریاست و ملک کے اہم ترین وکلا میں ہوتا ہے۔

آنند لہر کا بچپن بہت ہی آرام و آرائش میں گزرا تھا لیکن بعد میں ان کو طالب علمی کے دوران مالی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا، لیکن وہ ہمت نہیں ہارے اور اپنی تعلیم جاری رکھی اور اپنی معاشی ضروریات پورا کرنے کے لیے وہ ٹیوشن کراتے، جس سے ان کی مالی ضروریات پوری ہوئی ساتھ ہی ان کا علمی ذوق میں بھی اضافہ ہوا۔ بحیثیت طالب علم آنند لہر نے ہر مشکلات کا زندہ دلی سے مقابلہ کیا اور اس کا حل نکالا۔ آگے بڑھتے رہے اور ترقی کرتے رہے اور آخر وہ دن بھی آیا جب ان کی ضرورت سے زیادہ کمائی ہونے لگی۔ یہ صرف ان کی محنت کا نتیجہ تھا نہ کہ کسی کی طرف سے کوئی امداد یا تحفہ۔

آنند لہر ایک کامیاب وکیل، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت کو ابھارنے میں ان کے اخلاق و اطوار کا اہم رول ہے۔ انسانی ہمدردی، غریب پروری، اعلیٰ ظرفی، شرافت اور ادب نوازی ان کی صفات ہیں۔ وہ ہر کسی سے چھوٹا، بڑا، اپنا پرایا، وکیل گواہ، طالب علم، ادب نواز

وغیرہ ہر کسی سے سلیقے سے پیش آتے ہیں۔

دوران تحقیق میری ملاقات ان سے ہوئی تو میرے ساتھ نہایت خوش مزاجی اور حلیمی سے پیش آئے اور جتنا ہوسکا میری مدد کی۔ انتہائی مصروفیات کے باوجود بھی دوسروں سے ملنے کے لیے وقت نکالتے ہیں اور ہمیشہ اخلاقی خوش کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ ایک مہمان نواز، سخی دل اور حساس طبیعت کے انسان ہیں۔

آنند لہر کی شخصیت پر کئی حضرت نے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ اس ضمن میں اسیر کشتواڑی جنہوں نے آنند لہر کی شخصیت پر اظہار خیال کیا ہے:

> ''مجھے امین بنجارہ جیسے فاضل دوست کے توسل سے آنند لہر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے ان کو عاجزی اور انکساری کا مجسمہ پایا، جب وہ وکالت کا کام کرتے ہیں تو لگتے ہیں نہیں کہ وہ ایک مقبول تخلیق کار ہیں اور جب ادبی اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو وکیل کی کوئی نشانی تک نظر نہیں آتی، مگر حق تو یہ ہے کہ وہ بیک وقت اچھے قانون دان اور ادیب بھی ہیں۔ وکیل اور ادیب کو ایک ہی جسم میں دیکھنا ہو تو آنند لہر صاحب کا دیدار کیجئے۔ وہ چھوٹی اور سچی باتوں میں وقت گزارنے کا احساس نہ ہونے دیں گے۔''(1)

واقعی ان کی شخصیت کا یہ پہلو منفرد ہے، دو چہروں میں ایک انسان یعنی ادیب اور وکیل۔ اور خاص بات یہ ہے کہ اصل زندگی میں ان کا رول بخوبی نبھاتے ہیں۔ لیکن موجودہ صورتحال یہ ہے کہ ان کو بدقسمتی سے ہیڈ اسٹروک (Head Stroke) ہوا ہے جس کی وجہ سے پچھلے سات مہینوں سے ان کی طبیعت ناساز ہے اور زیر علاج ہیں اور پہلے کے مقابلے اب طبیعت میں کچھ بہتری آئی ہے۔ میں خدا سے کرتا ہوں کہ وہ جلد ہی صحت یاب ہو جائیں تا کہ وہ اپنے گھر، عدلیہ اور ادب کے فرائض کو بخوبی انجام دیں۔

☆☆☆

حواشی:

(1) اسیر کشتواڑی، آنند لہر تخلیقات کے آئینے میں (مضمون)، تسلسل (ششماہی مجلّہ)، جموں: شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی، 15/جولائی، 2005ء، ص:35

(ب)

ادبی خدمات

آنند لہر کو زمانۂ طالب علمی سے ہی ادب سے گہری دلچسپی تھی، اگر چہ کالج میں انھوں نے سائنس کے مضامین کا مطالعہ کیا تھا لیکن ادبی محفلوں میں اکثر شرکت کرتے تھے جہاں پر انھیں ادبا و شعرا کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ اور ان سے ملاقات بھی ہونے لگی جس سے ان کی دلچسپی مزید بڑھی۔

آنند لہر نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کالج کے زمانے سے ہی شروع کیا۔ ان کا تخلیقی سفر گورنمنٹ ڈگری کالج پونچھ (جموں و کشمیر) میں، جب انھوں نے اپنا پہلا افسانہ ''پتھر کے آنسو'' کالج کی میگزین ''آئینہ'' کے لیے آنند لہر کے نام سے لکھا تھا۔ یہ ان کی ابتدائی کوشش تھی لیکن کافی حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔ جس سے آنند لہر کے آنند لہر کا تخلیقی جوش و جذبہ اور شوق بڑھا۔

اس وقت کالج میں 'بزم ادب' کے نام سے ایک بزم بنائی گئی جس کا مقصد اردو زبان و ادب کو فروغ دینا تھا۔ ہر مہینے بزم کے تحت مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ بزم کے صدر نور حسین پونچھی تھے اور اس بزم کے ممبران مین جو لوگ شامل تھے ان میں گردھاری لال برق، شوال آزاد، بلراج رہبر، محمود الحسن، مقصود الحسن، ملوچن، درشن سنگھ کالی، باجے دیو سنگھ دت، سرون ناتھ اور آفتاب وغیرہ اس بزم کے ممبران تھے۔ آنند لہر بھی اس بزم میں ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور نہ صرف ادبی محفلوں میں شرکت کرتے بلکہ بعد میں صدارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔

آنند لہر نے ابتدا میں غزلیں کہیں لیکن انھیں اس میں کامیابی نہیں ملی۔ وہ رکے نہیں اور پھر اسٹیج ڈرامے لکھے۔ ان کا پہلا ڈراما ''کالج وداؤٹ ہاسٹل'' (Colledge Without Hostel) ہے جسے

انھوں نے یوم جمہوریہ کے موقع پر پیش کیا۔ان کا دوسرا ڈراما ''اسٹرایک آن نرک''(Strike on Narq) کے نام سے پیش کیا جوان دنوں کافی مقبول ہوا۔اسی زمانے میں انھوں نے ڈراما ''سرحد سے پہلے'' لکھا جو کالج میں اسٹیج کیا۔اس کے علاوہ آنند لہر ادبی سطح پر مختلف عہدوں پر فائز رہے۔آنند لہر انجمن ترقی اردو جموں وکشمیر کے صدر اور جموں کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے اردو کے فروغ کے لیے بنائی گئی کمیٹی کے ممبر اور بیشتر ادبی تنظیموں کے سرپرست رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آنند لہر پیشے کے لحاظ سے ایک اعلیٰ درجے کے وکیل ہیں اور وہ اس شعبے میں حد درجہ مصروف رہے اور نہ صرف وکالت بلکہ اپنی ذاتی مصروفیات بھی درپیش رہیں لیکن ان سب کے باوجود بھی لکھتے رہے۔واقعی ایسے میں ایک انسان سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔چونکہ آج کل کی روزمرہ زندگی میں انسان اپنے ذاتی مسائل اور پیشے کے متعلق الجھا رہتا ہے لیکن کچھ باظرف لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اندر کچھ اور بھی کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے اور ہر حالت میں اس جذبے کو وہ عملی شکل دیتے ہیں اور اپنے دل اور روح کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔آنند لہر کا نام بھی اسی زمرے میں آتا ہے کیونکہ ان کو اب کوئی مالی تنگی نہیں اور نہ ہی کوئی اور مسئلہ درکار ہے۔اس کے علاوہ آنند لہر کے دادا جی اور والد صاحب بھی شاعری کرتے تھے لیکن ان کا کلام موجود نہیں ہے۔مالک رام آنند ان کے چچا تھے،تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تخلیقی صلاحیت انھیں ورثے میں ملی تھی۔آنند لہر نے اس شوق، جذبے اور صلاحیت کی بنا پر آج تک متعدد تخلیقات کو قلمبند کیا جو منظر عام پر آچکی ہیں اور عوام میں بھی بیحد مقبول ہوئی ہیں۔

آنند لہر نے افسانے، ناول اور ڈرامے کے فن میں طبع آزمائی کی اور وہ اس میں کامیاب رہے۔ انھوں نے پانچ افسانوی مجموعے، پانچ ناول اور تین ڈرامے لکھے ہیں۔

ان کے پانچ افسانوی مجموعے تقریباً ایک سو چالیس افسانوں پر مشتمل ہیں، جس میں انھوں نے تصوراتی یا پھر داستانوی کہانیوں کو نہیں بلکہ ایسے سماجی حقائق کو پیش کیا ہے جو ہمارے گردونواح میں وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

آنند لہر کے پانچ افسانوی مجموعے درج ذیل ہیں:

(1) انحراف (2) کورٹ مارشل (3)سرحد کے اس پار

(4) بٹوارہ (5) سریشٹھ نے بھی یہی لکھا ہے

آنند لہر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''انحراف'' 1975ء میں پہلی بار شائع ہوا۔مقبولیت کی وجہ سے 2002ء میں ملک بک ڈپو نئی دہلی سے شائع ہوا۔

انحراف میں روایتی افسانے نہیں ہیں بلکہ تجریدی افسانے ہیں۔مطلب کی بات ان میں صاف کہہ دی گئی ہے۔گرچہ اس میں چھوٹے چھوٹے افسانے ہیں لیکن انسانی زندگی پر محیط ہیں۔

''سرحد کے اس اس پار'' آنند لہر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے 2001ء میں سیمانت پرکاشن، نئی دہلی سے شائع ہوا۔مجموعے کا نام شامل کہانیوں میں پہلی کہانی کے نام پر رکھا گیا ہے۔

تیسرا افسانوی مجموعہ ''کورٹ مارشل'' 2006ء میں مانوی پرکاشن، پنچ تیرتھی، جموں سے شائع ہوا۔ اس کی کہانیاں سماجی زندگی سے جڑی ہیں اور انسانی زندگی میں درپیش آنے والے مسائل کو آنند لہر نے ان کہانیوں میں بخوبی پیش کیا ہے۔

آنند لہر کا چوتھا افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' 2009ء میں اردو بک سوسائٹی، دریا گنج، نئی دہلی سے شایع ہوا۔اس میں بھی انھوں نے زندگی اور موجودہ عہد کے مختلف مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

پانچواں افسانوی مجموعہ ''سریشٹھ نے بھی یہی لکھا ہے'' 2015ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوا۔اس افسانوی مجموعے کا ہر افسانہ الگ نوعیت کا ہے جس میں انسانی زندگی کی مختلف پہلوؤں کی عکاسی بڑے فنکارانہ انداز میں کی ہے جہاں پہنچ کر آنند لہر کا فن ایک بلند سطح پر پہنچ جاتا ہے۔

ان تمام مجموعوں میں آنند لہر نے افسانوی انداز میں تجریدی، تمثیلی اور استعاراتی افسانوں کے علاوہ روایتی طرز کے بھی افسانے تحریر کیے ہیں اور ان میں کچھ افسانے نہ ہو کر افسانچے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں افسانے کی تمام لوازمات موجود ہیں۔

انگریزی میں افسانے کو Short Story کہتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی بھی کہانی اگر مختصر ہو تو Short Story ہو جائے۔افسانے میں ایک وحدت تاثر ہوتا ہے اگرچہ اس کا کینوس چھوٹا ہے۔

آنند لہر کے تمام افسانوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے افسانے دلچسپ ہوتے ہیں اور ایک باشعور قاری جب ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ نہ صرف لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ ان تمام سماجی حقائق سے واقف ہو جاتا ہے جس سے آنند لہر نے اپنی فنکارانہ صلاحیت سے پردہ اٹھایا ہے۔

اس کے علاوہ آنند لہر نے پانچ ناول تصنیف کیے ہیں۔ آنند لہر زندگی کے حقائق کو دیکھنے، سمجھنے اور برتنے کا اپنا ایک منفرد نظریہ رکھتے ہیں اور تخلیقی لمحوں میں وہ اپنے کردار، واقعات، حادثات، سانحات کے ذریعے اپنے داخلی و خارجی احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے فطری تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ آنند لہر کے پانچ ناول مندرجہ ذیل ہیں:

(1) سرحدوں کے بیچ (2) اگلی عید سے پہلے (3) مجھ سے کہا ہوتا

(4) یہی سچ ہے (5) نامدیو

ان کا پہلا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' ہے جو 1997ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب کشمیر کتاب گھر ریزیڈنسی روڈ جموں سے شائع ہوئی اور بعد میں 2004ء میں مانوی پرکاش، پنچ تیرتھی جموں سے دوبارہ شائع ہوئی۔ ''سرحدوں کے بیچ'' آنند لہر کا دوسرا ناول ہے جو 2002ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کا تیسرا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' ہے جو انھوں نے 2005ء میں کلاسک آرٹ پرنٹر، دریا گنج دہلی سے شائع کیا۔ ان کا چوتھا ناول ''یہی سچ ہے'' 2008ء میں اردو بک سوسائٹی روہیلا اسٹریٹ دریا گنج، دہلی سے شائع ہوا۔ پانچواں ناول ''نامدیو'' 2012ء میں اوشان پبلی کیشن روہیلا، دریا گنج، نئی دہلی شائع ہوا۔

یہ پانچوں ناول بہت عمدہ دلچسپ ہیں۔ گو کہ ناول کے فن میں بھی آنند لہر کامیاب نظر آتے ہیں۔ ناول کے عنوان بھی دلچسپ ہیں اور جب ہم ان کے ناولوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آنند لہر نے حوصلہ مندی سے سماج کے ان نازک پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے جن پر قلم اٹھانے کی ہر کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن آنند لہر نے ان تمام نازک اور ہنگامہ برپا کرنے والے موضوعات کو بخوبی پیش کیا ہے۔ آنند لہر نے نہ صرف ماضی میں ہوئے واقعات اور نہ ہی مستقبل میں رونما ہونے واقعات کو بیان کیا ہے بلکہ انھوں نے موجودہ دور کے حالات یعنی کہ جس ماحول اور جن حالات میں وہ خود رہے ہیں اپنے مطالعے، مشاہدے اور فنی صلاحیت

سے بخوبی پیش کیا ہے۔ آنندلہر خود جس سماج میں رہے اس سے بہت متاثر نظر آتے ہیں چونکہ ان کے ناولوں میں وہ تمام واقعات واحساسات وجذبات سمت کر سامنے آگئے ہیں۔ اگر چہ وہ ذاتی ہو یا جذباتی، ریاستی سطح کے ہوں یا ملکی یا پھر بین الاقوامی، عالم انسانیت اور کائنات کا احاطہ کرتے ہیں۔

چونکہ آنندلہر کا تعلق سرحدی علاقے سے رہا ہے۔ وہاں پر جو واقعات اور حالات انھوں نے خود دیکھے ہیں ان سے وہ بہت متاثر نظر آتے ہیں اور ایسا ہی ان کا ایک جذباتی ناول ''سرحدوں کے بیچ'' ہے، جس میں انھوں نے سرحدی علاقوں پر رہنے والے لوگوں کے حالات کا بخوبی جائزہ لیا ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ لیکن اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے ریاستی اور ملکی اور بین الاقوامی حالات کو بھی اپنے ناولوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔

ان کا ایک ناول ''اگلی عید سے پہلے'' ہے، جس میں انھوں نے ریاست جموں وکشمیر اور خاص طور پر کشمیر کے ان حالات کا بخوبی جائزہ لیا ہے جو تقسیم ملک کے بعد ہندستان اور پاکستان کے بعد ریاست جموں و کشمیر سیاسی طور پر شکار ہوئی۔ اور وہاں نہ ختم ہونے والی بدامنی اور دہشت گردی جو وہاں کے عوام کا مقدر بن گئی، تباہی و بربادی، خوں ریزی وقتل وغارت گری اور آخر کار ایک قوم جو اس تعصب کا شکار بنی اور اس کو اپنا عزیز وطن چھوڑنا پڑا اور انھیں اپنا ٹھکانہ ریاست اور ملک کے دیگر علاقوں میں جا کر بنانا پڑا اور بہت سی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ آنندلہر نے یہ ناول بقول جگناتھ آزاد ''سرزمین کشمیر کی ایک دردبھری داستان ہے جو مصنف نے خون دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھی ہے۔'' واقعی جب ہم اس ناول کا مطالعہ کرتے ہیں تو آزاد کی یہ بات بالکل سچ نظر آتی ہے۔

اس کے علاوہ ''یہی سچ ہے'' اور ''نامدیو'' بھی آنندلہر کے فن کا عمدہ نمونہ ہے۔ ناول ''یہی سچ ہے'' میں آنندلہر نے سماج کے ان حقائق سے پردہ اٹھایا ہے جن سے عام انسان کو لگتا ہے کہ یہی سچ ہے یعنی جو وہ دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے تو اسے یہی لگتا ہے یہی حق ہے جبکہ حقائق کچھ اور ہوتے ہیں۔ اور ناول ''نامدیو'' کا موضوع عشق ہے اور یہ ایک نفسیاتی ناول ہے۔

آنندلہر کا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' دلچسپ ہے جس میں آنندلہر نے اپنی افتادطبع کے مطابق ایک ایسے موضوع کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے جس کا تعلق اگر چہ ہمارے ہی دور سے ہے لیکن

نوعیت کے اعتبار سے ہر دور میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے یعنی طاقتور بننے کے لیے ہتھیاروں کی دوڑ اور ان کے استعمال سے پیدا ہونے والے نتائج جن سے انسان تو متاثر ہوتے ہی ہیں، لیکن چرند پرند بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہیں رہتے۔ یہ ناول اگرچہ امریکہ کے ہاتھوں عراق پر نازل ہونے والی تباہی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن یہ ایسے انسانی مسائل کا احاطہ بھی کرتا ہے جو آفاقی نوعیت کے حامل ہیں۔

اس کے علاوہ آنند لہر نے ڈرامے بھی تخلیق کیے ہیں جو اس طرح ہیں:

(1) نروان (2) سرحدیں (3) تپسوی کون؟

''نروان'' ان کے ڈراموں کا مجموعہ ہے جو 1988ء میں جے کے بک ہاؤس، ویر مارگ، جموں توی (جموں) سے شائع ہوا۔ اس میں چھ ڈرامے ''تیاگ''، ''کالی کہانی''، ''کھیل''، ''نروان''، ''گنہگار'' اور ''سپاہی کی آواز'' شامل ہیں جو سماجی اور سیاسی موضوعات پر مبنی ہیں۔

ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''سرحدیں'' کے نام سے گلستان پبلی کیشنز، کلکتہ سے 2005ء میں شائع ہوا۔ اس میں تین ڈرامے ''سرحدیں''، ''پل'' اور ''زندگی'' شامل ہیں۔ یہ ڈرامے اگرچہ مختصر ہیں لیکن اپنے اندر کافی تاثیر اور دلچسپی رکھتے ہیں۔

''تپسوی کون؟'' آنند لہر کا طویل ڈراما ہے جو تیرہ مناظر پر مشتمل ہے اور یہ ڈراما 1994ء میں شائع ہوا۔ یہ سماجی نوعیت کا ڈراما ہے جس میں ایمانداری، رشوت خوری وغیرہ دیگر سماجی مسائل کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس ڈرامے کا ہر منظر ایک نئی صورتحال لے کر سامنے آتا ہے اور کرداروں کے آپسی تال میل اور پلاٹ کی گرفت سے ڈرامے کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اس میں سماجی زندگی کے جن پہلوؤں کی ترجمانی کی گئی ہے وہ عصری مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مسائل کے حل کو زمانہ سازی، ابن الوقتی، اخلاقی نیز فلسفیانہ دلائل کی روشنی میں زیر بحث لانے کی خاطر مختلف کرداروں کی باہمی گفتگو، چال چلن اور مظاہراتی روپ کا بڑی خوبی سے سہارا لیا گیا ہے اور سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں رشوت خوری کی وجوہات اور بگڑے ہوئے سماجی ماحول کو سامنے لایا گیا ہے۔ جب اس سماج ہر کوئی کسی نہ کسی برائی میں ملوث اور ایک ہی حمام میں ننگے نظر آتے ہیں تو پھر ہم کسے ''تپسوی'' کسے کہہ سکتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آنند لہر کے فکشن میں افسانے، ناول اور ڈرامے تمام سماجی نوعیت کے ہیں۔ان میں داستانوی یا خلائی باتیں نہیں ہیں بلکہ زمینی حقائق ہیں، جن کو آنند لہر نے بخوبی نبھایا ہے۔اور ایک باشعور قاری جب ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ ان تمام سیاسی حقائق سے واقف ہوتا ہے جن کی طرف آنند لہر نے توجہ مبذول کرائی ہے۔

آنند کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ریاست اور ریاست سے باہر، ملکی سطح پر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے انھیں انعامات واعزازات سے نوازا ہے۔اس ضمن میں ان کو راجستھان اردو اکادمی انعام (1997ء)، اتر پردیش اردو اکادمی انعام (1997ء)، امریکن بیوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ کا مین آف دی ایوارڈ (1997ء)، میر اکادمی لکھنؤ انعام، پراچین کلا کیندر، چنڈی گڑھ انعام، جموں وکشمیر اردو فورم انعام، اُدیان اڑیسہ اعزاز، لالہ جگت نارائن جالندھر انعام، نمی ڈوگری سنستھان انعام، جموں وکشمیر رائٹر فورم اعزاز، ساہتیہ رتن ایوارڈ، سچیتنا دیوبند، یوپی، اور صدر جمہوریہ کی طرف سے افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' پر پچاس ہزار کا انعام۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں انھیں بہت سے انعام واعزازات سے نوازا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ماہنامہ ''شاعر'' (ممبئی) اور سہ ماہی ''رنگ'' (دھنباد)، ''عصری آگہی'' (دلی) اور ''تحریک ادب'' (بنارس) نے آنند لہر پر گوشے شائع کیے ہیں۔''آب جو'' (کشتوار جموں وکشمیر) ''آنند لہر نمبر'' شائع کیا۔اور ''اسباق'' (پونہ) اور ''شاندار'' (اعظم گڑھ) نے بھی آنند لہر کے گوشے مرتب کیے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے دیگر رسائل وجرائد جیسے ''جدید فکر وفن''، ''ہماچل پردیش ماہنامہ'' اور ''اردو دنیا'' ان کے فن پر مختلف مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

ان کا افسانہ ''بٹوارہ'' پر دوردرشن کے کشیر چینل سے پانچ اپی سوڈ کا سیریل ''تقسیم'' کے عنوان سے نشر کیا گیا اور ناول ''اگلی عید سے پہلے'' پر بھی پانچ اپی سوڈ کا ایک سیریل دوردرشن کشیر چینل سے نشر کیا گیا۔ دوردرشن کیندر جموں سے ان کے افسانوں کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا۔افسانہ ''برف ابھی سفید ہے'' پر بھی ڈراما نشر کیا گیا۔ڈی ڈی ٹی وی اور دوردرشن نیشنل پر آنند لہر کی ذات اور شخصیت پر بھی خصوصی پروگرام نشر کیے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ آنند لہر کے فن اور شخصیت پر ریاست اور ریاست سے باہر تعلق رکھنے والے مفکر، مقالہ نگار اور فنکاروں نے مضامین تحریر کیے ہیں جو مختلف جرائد اور رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں ظہورالدین، پرفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر سید معصوم رضا، پروفیسر جگناتھ آزاد، ابراہیم یوسف، افتخار احمد صدیقی، کمار پاشی، ڈاکٹر نصرت چودھری، خورشید کاظمی، رام پرکاش راہی، ڈاکٹر اسداللہ وانی، عشاق کشتواڑی، شام طالب، ڈاکٹر پریمی رومانی، ڈاکٹر محمد ایوب، نامی انصاری، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، اسیر کشتواڑی اور پروفیسر شہاب عنایت ملک وغیرہ اور بھی کچھ لوگ ہیں جنہوں نے آنند لہر کی تخلیقات کا تنقیدی کا جائزہ لیا ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں آنند لہر کا شمار نہ صرف اس عہد کے اہم وکلا میں ہوتا ہے بلکہ اردو کے اہم ادیبوں میں ہوتا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ عدلیہ میں انھیں سینئر ایڈوکیٹ شیام سندر کے نام سے جانا جاتا ہے اور ادبی دنیا میں آنند لہر کے نام سے وہ مشہور ہیں۔ جہاں ایک طرف اپنے پیشے میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں وہیں دوسری طرف اردو ادب میں خاص طور سے فکشن (افسانہ، ناول، ڈراما) کے فن میں کامیاب ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے پانچ افسانوی مجموعے، پانچ ناول اور تین ڈرامے ہیں جن میں انھوں نے مختلف موضوعات و مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ مختصر یہ کہ دورِ حاضر میں ریاست جموں و کشمیر کے فکشن نگاروں میں آنند لہر کا اہم نام ہے۔

☆☆☆

باب دوم

جموں کشمیر میں افسانہ نگاری اور آنند لہر بحیثیت افسانہ نگار

(الف) جموں کشمیر میں افسانہ نگاری: ایک مختصر جائزہ

(ب) آنند لہر کی افسانہ نگاری: ایک تفصیلی جائزہ

(الف)

جموں کشمیر میں افسانہ نگاری: ایک مختصر جائزہ

عہد قدیم سے پورے عالم میں ہندستان کی تہذیب وثقافت اور تاریخ منفرد رہی ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اس کا اثر مشرق ومغرب ہر جگہ پڑا۔ 1947ء میں ہندوستان میں جموری نظام قائم ہوا لیکن اس سے پہلے یہاں بادشاہ اور راجا الگ الگ ریاستوں میں حکومت کرتے تھے اور یہ حکومتی نظام 1947ء تک چلتا رہا۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت اور ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد اور آخرکار ہزاروں، لاکھوں لوگوں کی قربانی کے بعد ہندوستان کی آزادی لیکن اس سے پہلے ہندوستان کی تقسیم (ملک کا بٹوارہ ہندوستان اور پاکستان) جو برصغیر کی عوام کے لیے المیہ ثابت ہوا۔ ہندوستان کے دو ٹکڑے ہوئے ہندوستان اور پاکستان اور تقسیم کے نتیجے میں ہجرت کا پہلو سامنے آیا۔ اور پھر لاکھوں لوگوں کو نقل مکانی کرنی پڑی۔ اسی دوران ہزاروں لوگوں کا قتل ہوا۔ اس سے پہلے بھی ظلم وتشدد ہوا ہے لیکن ہندوستان کی تاریخ کا یہ المناک دوران برصغیر کی عوام کے لیے پریشانیوں اور مصیبتوں کا سبب بنا۔ ہندوستان میں 565 نوابی ریاستیں تھیں جن کا باضابطہ ہندوستان میں الحاق ہوا لیکن جہاں تک ریاست جموں وکشمیر کا تعلق ہے آج سے نہیں عہد قدیم سے وہاں کی ایک منفرد تہذیب وثقافت اور تاریخ رہی ہے۔ جموں وکشمیر میں مغلوں، افغانوں اور سکھوں کی حکومت کے بعد ڈوگرہ سلطنت قائم ہوئی۔ ڈوگرہ سلطنت کے بانی گلاب سنگھ تھے۔ اس نے انگریزوں سے ریاست جموں وکشمیر کو خریدا اور ریاست کا قیام عمل میں آیا اور 1947ء تک ڈوگرہ حکمرانوں نے حکومت کی۔ بعد میں ریاست جموں وکشمیر کا الحاق بھی ہندوستان کے ساتھ ہوا۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں ریاست کی درباری زبان فارسی تھی۔ اس وقت ریاست میں فارسی زبان کا بول بالا تھا اور نہ صرف دربار میں بلکہ کئی اور لوگ فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں کا ذوق رکھتے تھے۔ کشمیر کی بے شمار زرخیزی کا ثبوت کئی صدیوں سے وہاں کے لوگوں کی غیر معمولی ہنرمندی، مختلف زبانوں کے ادبی اور شعری نمونوں سے فراہم ہوتا ہے۔ عہد ماضی سے لے کر جدید دور تک سنسکرت، کشمیری، فارسی، ہندی اور اردو زبانوں میں وہاں کے تخلیقی ذہن کا اظہار ملتا ہے۔

ڈوگرہ حکومت گلاب سنگھ کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ ریاست کا حکمران بنا۔ جموں وکشمیر کی تاریخ میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کا نام مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے دیگر حکمرانوں کی طرح اپنا وقت عیاشی اور اپنے شوق پورے کرنے میں ہی نہیں گزارا بلکہ ریاست کی فلاح و بہبودی کے لیے کام کیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جموں میں ایک سنسکرت کالج قائم کیا اور اس کے علاوہ ایک لائبریری اور دارالترجمے کا بھی قیام کیا۔ اس دارالترجمے کے توسط سے سنسکرت اور فارسی کی کتابیں شائع ہوئیں اور بہت سے ڈوگری، ہندی اور اردو میں ترجمے ہوئے اور انھیں باضابطہ شائع کیا گیا۔ اس عہد میں عربی، فارسی اور انگریزوں زبانوں کی کتابوں کا بھی اردو میں ترجمہ ہوا۔

بدیابلاس پریس مہاراجہ رنبیر سنگھ کا ایک اہم رول ہے۔ یہ پریس 1882ء میں قائم کیا گیا اور ریاست کا پہلا بدیابلاس سرکاری گزٹ کے طور پر جاری ہوا اور یہ اخبار دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کو علوم وفنون سے گہری دلچسپی تھی اور ان کے دربار میں جو عالم و فاضل تھے بیشتر ان میں فارسی کے عالم تھے۔

اس عہد کے ادیبوں میں پنڈت ہرگوپال خستہؔ کا نام سرفہرست ہے۔ خستہؔ اعلیٰ پایہ کے شاعر اور نثر نگار تھے۔ ان کی کئی نثری کارنامے ہیں۔ ان کی ''گلدستۂ کشمیر'' اردو نثر میں کشمیر کی پہلی تاریخ مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب 1883ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ تاریخی اعتبار سے بھی اس کتاب کی اہمیت ہے۔ رنبیر سنگھ کا وزیر اعظم دیوان کرپارام کئی کتابوں کے مصنف تھے اور اردو زبان پر بھی پوری دسترس رکھتے تھے۔ وہ پہلا شخص تھا جنھوں نے ریاست کی انتظامی صورت حال پر رپورٹیں مرتب کروائیں اور ان کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا۔ یہ رپورٹیں اردو میں مرتب کروائی جاتی تھیں۔ ان رپورٹوں کو ریاست میں اردو نثر کا ابتدائی نمونہ کہا جاتا ہے۔

رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ 1885ء میں تخت نشین ہوئے۔ اس عہد تک اردو پڑھے لکھے لوگوں کا حلقہ بڑھ گیا اور عام لوگ بھی اس زبان میں دلچسپی لینے لگے۔ اردو زبان ذریعۂ اظہار بن گئی۔ خطہ جموں میں ڈوگری زبان کا بول بالا تھا جو لسانی اعتبار سے پنجابی اور اردو کے قریب ہے۔ اس طرح مہاراجہ نے اس کی مقبولیت کے پیش نظر 1989ء میں اردو کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا۔ اس کے بعد اردو نہ صرف سرکاری دفاتر اور عام بول چال میں استعمال کی جانے لگی بلکہ اس میں ادب بھی تخلیق ہونے لگا۔ ریاست کے مراسم ملک کے دوسرے حصوں میں تجارت وغیرہ کی غرض سے بڑھنے لگے اور باہر سے کچھ لوگ ریاست میں آباد ہوئے تو اس سے وہاں اردو زبان وادب میں اضافہ ہوا۔ اس دوران کئی ادیب و فنکار جنہوں نے اس وقت کے حالات کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے پیش کیا۔ اور 1924ء میں جموں سے ریاست کا پہلا اخبار ''رنبیر'' لالہ ملک راج صراف کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ اور 1933ء میں کشمیر سے سری نگر کا پہلا اخبار ''وتستا'' پریم ناتھ بزاز نے شائع کیا۔ اس سے ریاست کے قلمکاروں کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔ اس طرح کئی اور اخبارات شائع ہونے لگے۔ شیخ محمد عبداللہ نے 1935ء میں ''ہمدرد'' شائع کیا اور اسی سال کشمیری پنڈتوں کی انجمن کے پرچے ''مارتنڈ'' کا اجرا بھی ہوا۔ اس طرح ریاست میں قلمکاروں کا ایک بڑا گروہ سامنے آیا اور انھوں نے شاعری، ناول اور افسانہ، ڈراما، انشائیہ، تنقید، تحقیق وغیرہ ہر صنف میں جوہر دکھانے شروع ہوئے اور یہ سلسلہ آج تک چل رہا ہے اور آنے والے وقت میں بھی باضابطہ طور پر فنکار اپنی تخلیقات سے روشناس کراتے رہیں گے۔

جب ہم ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانہ نگاری کے تعلق سے مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے وہاں اردو افسانے کی طرف منشی محمد الدین فوق نے توجہ دلائی۔ اگر چہ مختصر اردو افسانے کی شروعات پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے کی تھی۔ اس وقت ہندوستان سیاسی اور سماجی اعتبار سے ایک عجیب دور سے گزر رہا تھا۔ ایک طرف آزادی کی جدوجہد اور دوسری طرف جاگیردارانہ نظام کی بربریت اور دیگر سماجی بدعتیں، ان حالات میں عوام کو افلاس، بے روزگاری، فاقہ کشی، جاہلیت اور نفسیاتی کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ اس وقت کے تمام حالات کا ذکر پریم چند اور دوسرے افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

اسی طرح ریاست جموں وکشمیر میں بھی افسانہ نگاری کی شروعات ہوئی اور یکے بعد دیگرے افسانہ نگاروں نے اس میں میدان میں قدم رکھا۔فوقؔ نے روش زمانہ کے مطابق کئی تاریخی اور نیم تاریخی قصے لکھے جنہیں ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کے اولین نقوش کہا جاتا ہے۔اس کے علاوہ چراغ حسن حسرت جن کی ادبی حیثیت ہمہ جہت ہے۔انھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی، تاریخ، دینیات، صحافت، شاعری اور افسانہ۔ان کے افسانوں کا مجموعہ ''کیلے کا چھلکا'' 1972ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

ریاست جموں وکشمیر میں اس وقت ادبی سرگرمیاں تھی اور کئی لوگ اس میدان میں جوش اور جذبے کے ساتھ اپنے ادبی ذوق کا مظاہرہ کر رہے تھے۔اس ضمن میں کئی انجمنیں قائم ہوئیں جہاں شعر وشاعری کے علاوہ افسانے بھی پیش کیے جاتے تھے۔پنڈت مکند کول کا نام اہمیت کا حامل ہے،ادب نواز تھے،ان کے گھر میں ادبی محفلیں ہوا کرتی تھیں، جہاں مختلف اصناف پر فنکار اپنی تخلیق پیش کرتے تھے اور ان پر اظہار خیال بھی ہوتا تھا۔گوکہ ایک ادبی فضا تیار ہوگئی اور عوام وخاص اور نوخیز اس میں دلچسپی لینے لگے اور اپنی دلچسپی کا اظہار بھی کرنے لگے۔

پریم ناتھ سادھو رونق جو بعد میں پریم ناتھ دَرؔ کے نام سے مشہور ہوئے، جو پنڈت مکند کول کے پوتے تھے۔جہاں ایک طرف ملک میں پہلے سے ہی ادبی فضا تیار تھی اور دوسری بات یہ کہ ریاست میں بھی ادبی ماحول قائم ہوا اور پھر گھر میں ادبی محفلیں، ایسے ادبی ماحول میں پریم ناتھ پردیسیؔ کی ذہنی نشوونما ہوئی اور وہ نثر اور شاعری کے ادب پارے تخلیق کرنے لگے۔

اس زمانے میں جموو کشمیر میں ڈوگرہ حکمرانوں کے ظلم و جبر کے خلاف شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں عوام نے آواز اٹھایا۔ایسے میں کوئی بھی حساس انسان اور فنکار خاموش نہیں رہ سکتا۔اس سے پہلے افسانہ نگار رومانی موضوعات پر افسانے لکھ رہے تھے لیکن بعد میں وہ سماجی حالات سے متاثر ہوکر رومانی طرز کی افسانہ نگاری کے بجائے حقیقت پسندانہ افسانے لکھنے شروع کیے۔پردیسیؔ نے بھی پہلے رومانی طرز کے افسانے لکھے لیکن بعد میں صرف اور صرف اپنے گردوپیش کے حالات کو انھوں نے اپنی کہانیوں میں بخوبی پیش کیا اور کشمیر اور کشمیریت ان کے افسانوں کا موضوع رہا۔ان کے تین افسانوی مجموعے ہیں ''دنیا ہماری'' (1940ء)، ''شام وسحر'' (1941ء) اور ''بہتے چراغ'' (1955ء)، علاوہ ازیں ان کا ایک اور ناول بھی ''پوتی'' کے نام سے شائع

ہوا۔ پریم ناتھ پردیسی نے کشمیریوں کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کے یہاں کشمیری زندگی، تہذیب وتمدن، غربت، بے روزگاری، ظلم، جبر، لوٹ و مار وغیرہ کی سچی اور صحیح عکاسی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ کشمیری زبان کے الفاظ کا استعمال بھی پردیسی نے کیا ہے۔ سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

''پردیسی کو کشمیر کی زندگی، تہذیب اور روایات سے محبت تھی اور ان ہی کو وہ اپنے افسانوں میں پیش کر کے عام انسانوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے، یہی ایک افسانہ نگار اور انسان کی حیثیت سے ان کی بڑائی ہے۔''(1)

پردیسی کی تخلیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کشمیری عوام کی دلی تمناؤں اور امنگوں کا بخوبی احساس تھا۔ ان کو شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ بیرون ریاست کے سیاح اور ادیب کشمیر میں صرف ایک ہی پہلو ''خوبصورتی'' دیکھتے ہیں۔ جبکہ وہاں کی عوام کئی مشکلات سے دوچار ہیں لیکن اس جانب کوئی دھیان نہیں دیتا۔ ان نقطے کو ابھارنے کے لیے انھوں اپنے فن کو بخوبی آگے بڑھایا۔ بقول سہیل عظیم آبادی:

''پردیسی کی زندگی کشمیر کے لیے تھی، ان کا فن کشمیر کے لیے تھا۔ اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ ان کے افسانوں کا ایک ایک لفظ اسی حقیقت کا شاہد ہے۔''(2)

پردیسی کے افسانوں میں کشمیری تہذیب اور روایت سمٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس نے اپنے افسانوں میں موجودہ حالات کے علاوہ کشمیر کی ہر چھوٹی بڑی پرانی روایات جیسے شادی کی روایت، سردیوں میں کانگڑیوں کا استعمال، گھروں میں مرغے پالنا وغیرہ کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔

کشمیر میں شادی بیاہ کا پورا انتظام گھر میں ہی کیا جاتا ہے اس لیے کوئی شادی کا سامان کرایے پر نہیں لیا جاتا۔ خاندان کے تمام رشتہ داروں اور دوست واحباب کو دعوت دی جاتی ہے اور سب مل جل کر ایک ہی گھر میں خوشیاں مناتے ہیں۔ بارات کا استقبال کرتے ہیں اور عورتیں دو قطاروں میں کھڑی ہو کر گیت گاتی ہیں وغیرہ۔ ان رسومات کو پردیسی نے افسانہ ''ٹیکہ بٹنی'' میں بخوبی پیش کیا ہے:

''وہ اوپر دیکھتی ہے جہاں دلہن کو سنگار ہو رہا ہے اور رنگارنگ پوشاک میں ملبوس پنڈتانیاں کھڑکیوں سے ایک دوسرے کے اوپر جھکی ہوئی دولہے کو دیکھ رہی ہیں اور وہ دن یاد کر رہی ہیں جب ان کا دولہا بھی اس

طرح آنگن میں منڈپ پر کھڑا تھا اور مسلمان عورتیں ایک کونے میں گا رہی تھیں۔

'سرٔکن وتھرے مٹہ کوفو روعشقہ بمبو دولیلہ آ کھو'

...پگلی اب دولہا اور دولہن کے سر پر پیسے اور روپے، آنے دو، پھینکے جائیں گے، جتنے ہاتھ آئیں اٹھانا۔''(3)

اس کے علاوہ وہاں کی پرانی روایت ہے کہ گھروں میں مرغے پالے جاتے ہیں جن میں مرغے اکثر صبح سویرے بانگ دیتا ہے اور لوگ مرغ کی بانگ سن کر اپنے وقت پر بیدار ہو جاتے ہیں اور کانگڑی جو کہ کشمیری تہذیب کی شناخت ہے، وہاں لوگ اکثر ٹھنڈ سے بچنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور کپڑے بھی سکھاتے ہیں۔ وہاں لوگ سماوار کی چائے پیتے ہیں اور پھر اس وقت ٹانگے پر سفر کیا جاتا تھا۔ پردیؔسی ان سب کو بخوبی پیش کیا ہے یعنی کہ پردیؔسی نے کشمیر کو ہر زاویے سے دیکھا اور اپنی کہانیوں میں جا بجا وہاں کا منظر دکھایا ہے۔ جہاں ایک طرف انھوں نے رسومات، غربت کو پیش کیا وہیں دوسری طرف کشمیر کے خوبصورت مناظر، موسم، یعنی موسم سرما کی شدت بھری سردی میں برف سے ڈھکی ہوئی وادی، موسم بہار کے حسین نظارے، اس کے علاوہ پردیسی کو کشمیر کی عوام سے ہمدردی تھی، ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے تھے، جس کا احساس ان کی کہانیوں سے ہوتا ہے۔ پریم ناتھ پردیسی ایک جگہ لکھتے ہیں:

''کشمیر کا ہر بدنصیب باشندہ خود ایک افسانہ ہے جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ باہر کے چند نامور افسانہ نگاروں نے کچھ کہانیاں ضرور لکھیں مگر وہ بھی غلط انداز میں۔ یہاں پر سب سے بڑا مسئلہ غلامی ہے، افلاس ہے۔''(4)

برج پریمی کے مطابق پردیسی نے کشمیر کو اپنے افسانوں میں پہلی بار پیش کیا اور لاکھوں کشمیریوں کو زبان دی۔ مختصر یہ کہ پریم ناتھ پردیسی کو جموں وکشمیر کا پہلا باقاعدہ افسانہ نگار مانا جاتا ہے۔

پریم ناتھ درؔ کا اہم نام ہے۔ 1914ء میں کشمیر کے ایک پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پریم ناتھ پردیسی کے معاصرین تھے لیکن ان کے بعد افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ درؔ کشمیر کی مقامی ادبی انجمنوں

میں شریک ہوتے جہاں ان کی ملاقات اس عہد کے دیگر فنکاروں سے ہوئی اور اس کے بعد ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا لیکن وہ کشمیر کو کبھی نہیں بھولے۔ پریم ناتھ در کا نام اردو افسانہ نگاری کی تاریخ امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا شمار ریاست کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کو اپنے وطن سے بے حد محبت تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے کشمیر سے باہر رہ کر بھی کشمیر اور وہاں کے عام لوگوں کو ہی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ کشمیر کے ذرے ذرے سے آگاہ تھے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیری تہذیب و ثقافت کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

برج پریمی کے مطابق ''پردیسی کے ساتھ اور ان کے بعد جن افسانہ نگاروں نے کشمیریت کا احساس دلایا ان میں در کا نام سرفہرست ہے۔ پردیسی کی طرح در نے بھی کشمیر کی جنت کا ذکر بہت کم کیا ہے۔''(5)

بقول سید احتشام حسین:

> ''کشمیر جو بار بار ان کے افسانوں میں آتا ہے اپنی وہ جنت بدوش عظمتیں لیے ہوئے نہیں آتا جن سے رومانوں کا افسوں جگانے کے لیے فضا تیار ہوتی ہے بلکہ اس میں غم آلودہ اور نشتر آگیں کسک بھرتا ہے جس سے ہم کشمیر کی حقیقت کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔''(6)

واقعی پریم ناتھ در نے کشمیر کے زمینی حقائق کو اپنے فنکارانہ انداز میں بخوبی پیش کیا ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کشمیر کی خوبصورتی، اونچے پہاڑ، حسین وادیاں، قدرتی مناظر، زمین پر جنت سے کم نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ سیاسی و سماجی حالات کی وجہ سے آج نہیں سینکڑوں سالوں سے وہاں ناداری، بھوک، افلاس، اور جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے وہاں کی عوام خستہ حالت میں اپنا وقت گزار رہی ہے۔ جس کا اظہار پردیسی کے بعد در کی کہانیوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ در کے موضوعات ہمارے آس پاس کی زندگی اور اس سڑے ہوئے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں جن سے زندگی قریب تر محسوس ہوتی ہے۔

پریم ناتھ در کے دو افسانوی مجموعے ''کاغذ کا واسدیو'' (1949ء) اور ''نیلی آنکھیں'' (1960ء) میں شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ ''چناروں کے سائے ہیں'' ایک اور ان کا افسانوی مجموعہ ہے جسے آر حسرت گڑا نے 1991ء میں ترتیب دیا۔ جس میں ان کے چنندہ افسانے ہیں۔

درؔ کو منظر کشی میں کمال حاصل تھا۔ ان کے افسانوی مجموعے ''نیلی آنکھیں''، جس میں انھوں نے ڈل جھیل کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ ڈل کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور اس کے ساتھ جفاکش کسانوں کی مجبوری جو کھر درے تختوں سے اپنے لیے ایک چھوٹی سی کشتی تیار کرتے ہیں اور جہاں ڈل میں بڑے بڑے شکارے ہوتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''یوں تو آسمان کا آسمان اتنا صاف تھا جیسے ڈل میں اتر کر منہ دھو کے ابھی ابھی اوپر چلا گیا ہو۔ اور لگتا بھی تھا کہ ڈل اور اس کے آسمان میں کوئی بات ضرور ہے کیونکہ دیکھتا ہوا آدمی اس وقت یہ نہیں بتا سکتا کہ ڈل میں نیلاہٹ اپنی ہے یا آسمان کی۔ اتنی ہوا سے ہی پانی کے ہموار پھیلاؤ میں سلوٹیں پڑ گئی ہیں اور اضطراب کی سفید چمک میں بھی نیلاہٹ کی گہرائی ابھرتی تھی۔ جسن جمود کے تماشائی اپنی اپنی کشتیاں نیم جان نالوں کی طرف نکال چکے تھے اور ڈل کا پانی بھاری بھاری پہاڑوں کے عکس کو رقص میں لا چکا تھا۔ کشمیر کی ایک چھوٹی کشتی ابھر آئی جس پر نہ چھت ہوتی ہے اور نہ بیٹھنے کا آرام۔ کشمیری شکارے کے سامنے اس کو کشتی نہیں کہا جاسکتا۔ شکارے کے ساتھ اس کا کیا مقابلہ! شکارے ایک کشش کو لے کر چلتے ہیں، پردوں، گدوں، اسپرنگوں کی لوریاں لے کر، شائستہ سیاحوں کے لیے، پرذوق شیدائیوں کے لیے تھکے ہوئے انسانوں کے لیے، اور یہ چیز تو ڈل کی محض سبزیاں اٹھانے، مچھلیاں لے جانے کو، پانی کا پڑوسی، جھیل کا جفاکش کسان کھر درے تختوں سے بنالیتا ہے اور کمبخت اس کے سروں پر نوک تک نہیں رکھتا۔'' (7)

جی۔ آر۔ حسرت گڑا لکھتے ہیں:

> ''پریم ناتھ درا پنے ثقافتی ورثے کو ساتھ لے کر ہی ترقی پسند تحریک کے لیے کام کر رہے تھے، ان کا کہنا ہے کہ کشمیر کی شاندار ثقافتی ماضی کو میں فراموش نہیں کروں گا جس ثقافتی ماضی کی چھاپ برصغیر کی تاریخ پر چھائی ہوئی تھی۔'' (8)

درؔ کے افسانوں کا پلاٹ، موضوع، کردار، ماحول کشمیری ہے اور کشمیری زبان کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ مثلاً کینہ بوب (دریائی پھل)، ہل (زیر آب پودا)، شیشر گانٹھ، کانگڑی، سماوار وغیرہ۔

پریم ناتھ در نے کشمیری تہذیب وثقافت کے پوشیدہ نقطوں، وطن پرستی، غریب اور افلاس، محنت کش کسان کے علاوہ کشمیری کاریگری، دستکاری، وہاں کے لباس، روزمرہ میں استعمال کی جانے والی چیزیں، موسم، عادات واطوار کو اپنی کہانیوں میں بخوبی پیش کیا ہے۔ ان کا مشاہدہ اتنا گہرا ہے کہ واقعی حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔

جموں کشمیر کے افسانہ نگاروں کو اتنی سہولیات نہیں تھیں جتنی ملک کے دیگر فنکاروں کو دستیاب تھیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہاں لوگوں کے اندر ذوق وشوق پہلے سے ہی تھا اور جس کا ثبوت ان کی تخلیقات ہیں۔ ایسے بھی کئی فنکار تھے جو ایک عرصے سے لکھتے رہے لیکن ان کے افسانوی مجموعے شائع نہیں ہوئے پھر بھی وہ لوگ لکھتے رہے اور مقامی اخبارات میں ان کی کاوشیں شائع ہوتی رہیں۔ ان میں خاص طور پر دینا ناتھ واریکو، تیرتھ کاشمیری، شیام لال ایمہ، ویروشور، نندلال بے غرض، دینا ناتھ دلگیر، اسیر کاشمیری، کوثر سیمابی، کیف اسرائیلی، محمود ہاشمی، دیا کرشن گردش، عزیز کاش، محبوبہ یاسمین، صاحبزادہ محمد عمر، کاشی ناتھ کنول، گلزار احمد فدا، جگدیش کنول اور غلام حیدر چشتی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

لیکن ان کے علاوہ اسی دور میں لکھنے والے جنھوں نے اس وقت کی سماجی، سیاسی، اقتصادی بدحالی کے علاوہ نفسیاتی کشمکش کو اپنی فنکارانہ بصیرت سے پیش کیا۔ ان میں رامانند ساگر، قدرت اللہ شہاب، نرسنگھ داس نرگس، کشمیری لال ذاکر، گنگا دھر دیہاتی وغیرہ ہیں۔

نرسنگھ داس نرگس پہلے مولا کوٹی اور پریم منوہر کے نام سے لکھتے رہے۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہوئے، جن میں ''دکھیا سنسار'' اہم ہے۔ ان کی کہانیوں میں دیہاتی زندگی کی عکاسی خاص طور پر نظر آتی ہے۔ گو کہ انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع دیہات اور وہاں کی زندگی کو بنایا۔ اس کے علاوہ جاگیردارانہ نظام کی استحصالی کو دیکھ کر بھی متاثر ہوئے۔ ان کے افسانوی مجموعے ''دکھیا سنسار'' ہے یعنی کہ دکھی دنیا۔ اس دنیا میں عام لوگوں کو افلاس، پریشانی اور غربت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نرسنگھ داس نرگس صحافت سے بھی وابستہ تھے۔ گنگا دھر دیہاتی بھی صحافت سے وابستہ تھے لیکن وہ کہانیاں بھی لکھتے رہے۔ پہلے منی کہانیاں لکھتے تھے جو کافی مقبول ہوئیں۔ دیہاتی بھی وقتی حالات سے متاثر تھے، اس لیے ان کی کہانیوں کے موضوعات معاشی اور اقتصادی حالات پر مبنی تھے۔ عبدالقادر سروری کے مطابق دیہاتی نے 300 سے زائد افسانے لکھے۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔اس کے علاوہ ان کا ایک ادبی کارنامہ ان کی خودنوشت ''شہاب نامہ'' ہے، جس کو تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ان کا پہلا افسانہ ''چندراوتی'' تھا۔''یا خدا'' ان کی اہم تخلیق ہے۔ان کا ایک اہم افسانہ ''ماں'' ہے جو 1958ء میں لاہور سے شائع ہوا۔شہاب تقسیم وطن کے بعد پاکستان چلے گئے۔

رامانند ساگر کشمیر رہنے والے تھے۔انھوں نے کشمیر کے پس منظر میں بہت کہانیاں لکھیں بعد میں کشمیر چھوڑ کر ممبئی چلے گئے اور وہاں کئی فلمیں اور ٹی وی سیریلز بنائے جو کافی مقبول ہوئے۔اگر چہ وہ ممبئی میں رہے لیکن پھر بھی ان کی کہانیوں میں کشمیر کے موضوعات ہیں۔''ٹنگمرگ کے اڈے پر'' اور ''کشمیر کی بیٹی'' ان کے دو مقبول افسانے ہیں۔

کشمیری لال ذاکر اردو ادب میں اہم نال ہے۔انھوں نے افسانے اور ناول کے علاوہ دیگر اصناف ناولٹ، ڈرامے، شاعری، خاکہ، سفرنامہ وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی۔ان کا ادبی سفر بھی طویل رہا۔ان کے افسانوں کے موضوعات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔انھوں نے کشمیری معاشرے کے متعلق، ہندو پاک کے تعلقات، خواتین سے متعلق و دیگر سماجی و سیاسی مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔کشمیری لال ذاکر ادب میں مقصدیت کے قائل رہے۔ان کی کہانیاں انسانی زندگی سے جڑی ہوئی، سماجی صداقتوں کو اجاگر کرتے ہوئے سماج کو اعلیٰ انسانی اقدار اور ایک صحت مند معاشرے کی تعمیری کا پیغام دیتی ہیں۔

جموں و کشمیر میں 1946ء کے آس پاس ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہوئی اور اسی کے ساتھ اس عہد کے تمام ادیب و شاعر اس سے وابستہ ہوئے۔حالانکہ اس سے بہت پہلے وہاں کے فنکار ترقی پسندی کے تحت اپنی تخلیقات کو پیش کر رہے تھے۔لیکن اس کے بعد وہاں ہفتہ وار مجلس کا انعقاد ہونے لگا۔اور بعد میں کشمیر میں ''کلچرل فرنٹ'' کے نام سے ایک تمدنی محاذ کی بنیاد پڑی اور اس کے ساتھ وہی لوگ وابستہ ہوئے جو ترقی پسند خیالات سے متاثر تھے۔1947ء کے سیاسی، سماجی حالات کے ساتھ اردو افسانہ بھی بدلنے لگا اور نہ صرف موضوع بلکہ فن اور تکنیک میں بھی تبدیلی آئی۔افسانوں میں ارضیت یا کشمیریت برقرار رہی لیکن اب ارضیت کے دائرے میں کشمیر کے پرانے دکھ درد کے ساتھ کشمیر کی تقسیم، ہجرت، قبائلی حملہ، شخصی حکومت کا خاتمہ، آزادی،

عوامی حکومت کا قیام جیسے موضوعات بھی شامل ہو گئے۔ کرشن چندر، کشمیری لال ذاکر، غلام رسول سنتوش، شبنم قیوم وغیرہ نے ان موضوعات کو بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنے متعدد افسانوں میں برتا۔

موہن یاور تعلیم مکمل کرنے کے بعد صحافت سے بھی وابستہ ہوئے۔ روزنامہ ''سندیش'' جموں میں کام کرتے تھے۔ ادبی زندگی کا آغاز تقسیم ہند سے پہلے کیا لیکن تقسیم ملک کے بعد باقاعدہ طور سے ادبی دنیا میں جڑ گئے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے ''وہسکی کی بوتل'' (1958ء)، ''سیاہ تاج محل'' (1961ء)، ''تیسری آنکھ'' اور ''دو کنارے'' (1962ء) قابل ذکر ہیں۔ ریاستی کلچرل اکیڈمی کی طرف سے ان کو انعام بھی ملا۔ انھوں نے ایک ناول ''پتھروں کا شہر'' بھی تحریر کیا۔ ''توی اور جہلم'' کے عنوان سے ایک افسانوی مجموعہ بھی ترتیب دیا جس میں ریاست کے معروف قلمکاروں کی کہانیاں شامل ہیں۔

موہن یاور کے افسانوں میں کشمیری تہذیب کے کئی نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھوں نے کشمیری کاشت کاری اور صنعت کاری کے مسائل کو بھی پیش کیا۔ وہاں کاشت کاری کے باوجود بھی لوگ غریبی اور افلاس میں زندگی بسر کرتے تھے کیونکہ ساہوکار ان کی محنت کا پھل نہیں دیتے تھے بلکہ ان پر لگان اور بے گاری وغیرہ کے مظالم ڈھائے جاتے اور لوگ احتجاج کرنے پر اتر تے۔ موہن یاور نے ان حالات کا بخوبی جائزہ لیا۔ اس ضمن میں ان کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''لکڑی ہم کاٹتے ہیں، چیرتے ہیں، پھاڑتے ہیں، تو ند ہمارے شاہ کی بڑھتی ہے، سیٹھ دن بھر تخت پر بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا ہے۔ محنت ہم کرتے ہیں۔ پسینہ ہمارا بہتہ ہے، لہو رستا، جان دکھتی اور روپیہ شاہ کی تجوری میں جاتا ہے، ہمارا روپیہ ہم بھوکے ہمارے بچے بھوکے، سبزی ہم اگاتے ہیں، سیب، ناشپاتی، آخروٹ، بادام اور راجماش کے داتا ہم، ہم ہی بھوکے مرتے ہیں۔ یہ کھیت ہمارے ہاتھوں سے لہلہاتے ہیں، ہم کھیتوں کی مانگ سجاتے ہیں، کشتی ہم چلاتے ہیں، شال ریشم ہمارا، ہم فنکار ہمارے بچے ننگے، ہمارے بھائی ننگے۔''(9)

موہن یاور انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اس بات کا ثبوت مذکورہ بالا اقتباس میں بخوبی

دیکھنے کو ملتا ہے۔ موہن یاور نے یہاں ایک عام کسان کے جذبات کی منظر کشی جس ربط و تسلسل سے کی ہے واقعی قابل داد ہے۔ برج پریمی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''موہن یاور منجھے ہوئے فنکار ہیں۔ وہ کہانی کے فن پار قادر ہیں، منٹو اور بیدی کی طرح الفاظ کے کم از کم استعمال سے تاثیر کی وحدت قائم کرتے ہیں۔ موہن کے یہاں عصر حاضر کے انسان کا درد و کرب ملتا ہے۔''(10)

واقعی موہن یاور نے اس عہد کے عام لوگوں کے حالات، ان کے دکھ درد کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔ اور یہ نہ صرف اس عہد تک ہی محدود ہے بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہر دور کے عام انسان کی آہ وزاری ہے۔

جموں و کشمیر کی ادبی دنیا میں ٹھاکر پونچھی اہم نام ہے۔ پونچھ کے رہنے والے تھے۔ فنکارانہ ذہن رکھتے تھے۔ وقت اور اردگرد کے ماحول سے متاثر ہو کر انھوں نے کئی کہانیاں تحریر کیں۔ افسانوں کے علاوہ انھوں نے عمدہ ناول بھی لکھے۔

ان کا پہلا ناول ''وادیاں اور ویرانے'' کا شمار آج بھی مقبول ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی پہلی کہانی کا عنوان ''کالکی'' تھا جو جموں کے مقامی اخبار ''چاند'' سے شائع ہوئی۔ ان کے افسانوی مجموعے ''زندگی کی دوڑ''، ''چناروں کے چاند'' اور ''یادوں کے کھنڈر'' قابل ذکر ہیں۔ ان کا انداز تحریر منفرد ہے جو شعریت اور رچاؤ سے بھرپور ہے۔

48-1947ء کے بعد ریاست جموں و کشمیر سیاسی اعتبار سے ایک نئے مرحلے سے گزری۔ ملک کے بٹوارے اور آزادی کے بعد دیگر ریاستوں کا مرکز کے ساتھ الحاق، اس سیاسی تذبذب کا اثر ریاست کی سیاست اور اس کی سماجی اور ادبی زندگی پر پڑا۔ نئے تقاضوں کو پیش نظر ریاست میں ''قومی کلچرل فرنٹ'' کی بنیاد پڑی جس کی بدولت گوشہ نشینی میں پڑے فنکار بھی سامنے آئے اور بڑے ذوق و شوق سے دلچسپی لینے لگے۔ نئے لکھنے والوں کا کارواں سامنے آیا۔ ان میں سومناتھ زتشی، علی محمد لون، اختر محی الدین، بنسی نردوش، دیپک کول، تیج بہادر بھان، مالک رام آنند، ویدراہی وغیرہ نے افسانے لکھے۔ یہ لوگ اردو کے علاوہ کشمیری میں بھی لکھتے تھے۔ ان میں اختر محی الدین کا نام اہم ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اردو افسانہ نگاری سے کیا۔ ''بونڈر رچ''

ان کی ایک کہانی ہے جس سے ان کی فنکارانہ صلاحیت، مشاہدہ اور ان کے باطن کا کرب دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ کشمیری میں لکھنے لگے۔

تیج بہادر بھان محلّہ حبہ کدل سری نگر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ادبی زندگی کا آغاز کا 1951ء میں کیا۔ ان کی پہلی کہانی ''لال چنری'' ہے۔ دو افسانوی مجموعے ''جہلم کے سینے پر'' (1960ء)، ''عورت'' (1962ء)، اس کے علاوہ ایک ناول ''سیلاب اور قطرے'' (1967ء) میں شائع ہوئے۔

تیج بہادر بھان نے ابتدا سے ہی رومانیت سے انحراف کرتے ہوئے اپنی ایک نئی روش اختیار کی۔ ان کے افسانے کشمیری عوام کی زندگی پر مبنی ہیں۔ کشمیر کے دکھ درد، طرز زندگی کے علاوہ وہاں کے رسم و رواج اور عقائد کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔ افسانہ ''جوتے'' میں انھوں نے کشمیر کے عقیدت مند لوگوں کو بھوانی دیوی کی یاترا کے بارے میں دکھایا ہے اس کے علاوہ کشمیری سماوار اور پھرن وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

دیپک کول ترقی پسند تحریک سے وابستہ اور کلچرل کانگریس کے سرگرم رکن رہے۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے۔ ان کی زبان قابل رشک اور اسلوب میں نکھار تھا۔ ''شیڈک کے نام ایک خط''، ''جب گدھ ڈوب گئے''، ''بات کل رات کی'' ان کی عمدہ کہانیاں ہیں لیکن بعد میں وہ ہندی میں ہی لکھنے لگے۔

کچھ عرصہ بعد دیگر افسانہ نگار اس کارواں میں شامل ہوئے۔ ان میں پشکر ناتھ، حامدی کاشمیری، برج پریمی، امیش کول، ہری کرشن کول، غلام رسول سنتوش، جگدیش بھارتی، برج کتیال، زیڈ سیمی، نورشاہ، محمود بدخشی، وجیہ احمد اندرابی، رام کمار ابرول وغیرہ۔ ان لوگوں نے موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے بھی تجربے کیے۔ قدیم روایتوں، رومانیت سے انحراف کر کے محنت کش طبقہ، ریاسی عوام کی اور سماجی حقائق کی تلخیوں کو روشناس کرایا اور ان کی ترجمانی بھی کی۔

پشکر ناتھ نے اردو افسانوں کے علاوہ ٹی وی اور ریڈیو ڈرامے بھی تحریر کیے اور ''دشت تمنا'' کے نام سے ایک ناول بھی لکھا ہے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے ''اندھیرے اجالے''، ''ڈل کے باسی''، ''عشق کا چاند اندھیرا'' اور ''کانچ کی دنیا'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے ''ڈل کے باسی'' پر ریاستی کلچرل اکیڈمی نے انعام سے نوازا اور یوپی اردو اکیڈمی نے انعام دیا۔ ان کی بیشتر کہانیاں کشمیر کی سیاحی، سماجی اور

اقتصادی زندگی کے ساتھ ساتھ کشمیری تہذیب وثقافت کی ترجمان ہیں۔پشکر ناتھ نے کہانیوں میں مختلف تکنیک کو برتا ہے۔

ریاست کی ادبی دنیا میں حامدی کاشمیری ایک اہم نام ہے۔انھوں نے افسانوں کے علاوہ ناول، شاعری،تنقید وغیرہ بھی بھی طبع آزمائی کی۔حامدی کی تنقید پر 29 کتابیں ہیں،شاعری کے دس مجموعے ہیں اور پانچ ناول ہیں۔وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔تخلیقی قابلیت کی بنا پر انھیں کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ پدم شری کے علاوہ کئی اکادمیوں، ساہتیہ کلچرل، اتر پردیش، بنگال، بہار اکادمیوں کے علاوہ غالب ایوارڈ بھی نوازا گیا ہے۔

ان کے چار افسانوی مجموعے:''وادی کے پھول''(1957ء)،''سراب''(1959ء)،''برف میں آگ''اور''شہر افسوں''منظر عام پر آ چکے ہیں۔

ان کی اکثر کہانیوں میں کشمیری ماحول، رہن سہن، طرز زندگی، سماجی و سیاسی حالات اور وہاں کے لوگوں کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ان کے افسانے کشمیر کے قدرتی حسن، پہاڑوں پر برف پوش چوٹیوں، چناروں اور شہتوت کے درختوں، وہاں کے رسم ورواج کا عکس ہیں۔

برج پریمی کو ماہر منٹو مانا ہے لیکن انھوں نے کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ان کی پہلی کہانی کا عنوان''آقا'' جو 1949ء میں شائع ہوئی۔ان کا افسانوی مجموعہ''سپنوں کی شام''1995ء میں منظر عام پر آیا۔اس کے علاوہ انھوں نے کتابیں بھی تصنیف کیں۔ان کی ایک کتاب''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما: تحقیق وتنقید''عمدہ کتاب ہے۔جس میں انھوں نے ریاست جموں کشمیر میں اردو نثر، افسانہ، ناول، ڈراما، تنقید، صحافت کے علاوہ ترقی پسند تحریک، ریاستی کلچرل اکادمی کی ادبی خدمات اور ریاست کے تمدنی ادارے کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔

ریاست کی ادبی دنیا میں نور شاہ کا اہم نام ہے۔انھوں نے افسانوں کے علاوہ ناول، ڈراما، کالم اور تذکرہ بھی لکھا ہے۔ان کے چھ افسانوی مجموعے''بے گھاٹ کی ناؤ''،''ویرانے کے پھول''،''من کا آنگن اداس اداس''،''گیلے پتھروں کی مہک''،''بے ثمر بیج اور آسمان''،''پھول اور لہو''خصوصیت کے حامل ہیں۔ان کے افسانوں میں کشمیر کا ذکر بخوبی ملتا ہے۔وہ کشمیر کی آب وہوا میں پلے بڑھے۔وہاں کی تہذیبی وثقافتی، سماجی و

روایتی عادات واطوار کا ہو بہو نقشہ ان کی کہانیوں میں ملتا ہے۔ گو کہ نور شاہ نے کشمیر کو ہر زاویے سے دیکھا اور ان کا ہو بہو عکس ان کی کہانیوں میں ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی وسیع تہذیب وثقافت کو سمیٹا، وہاں کی تاریخ، سیاست، معیشت، اقتصادی اور سماجی پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور فنی بصیرت سے بخوبی پیش کیا۔

1960-65ء کے بعد جہاں ایک طرف ملک میں سائنسی ترقی ہوئی اور ہمارے سماج میں کئی تبدیلیاں ہونے لگیں ان کا اثر ادب پر بھی پڑا اور اردو افسانے میں بھی موضوع، ہیئت اور تکنیک میں تبدیلی آئی۔ فنکاروں نے بھی بدلتے وقت میں تکنیک اور موضوع کو بدلا اور اس کے ساتھ ہی کئی اور نئے افسانہ نگاروں نے افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ ان میں ورندر پٹواری، عمر مجید، کشوری منچندہ، شمس الدین شمیم، مالک رام آنند، اوپی سارتھی، ڈی کے کنول، امرنا لموہی، راجیش گوہر، کلدیپ رعنا، موتی لال کپور اور شبنم قیوم قابل ذکر ہیں۔

ورندر پٹواری کے نو افسانوی مجموعے اردو میں اور ایک کشمیری میں منظر عام پر آ گئے ہیں۔ ان کے اردو افسانوی مجموعے ''فرشتے خاموش ہیں'' (1981ء)، ''دوسری کرن'' (1986ء)، ''بے چین لمحوں کا تنہا سفر'' (1988ء)، ''آواز سرگوشیوں کی'' (1995ء)، اور ''ایک ادھوی کہانی'' (2002ء)، ''افق'' (2003ء)، ''دائرے'' (2010ء)، ''آفتوں کے دور میں'' (2011ء) اور ''لالہ رخ'' (2013ء) منظر عام پر آ چکے ہیں۔

کشمیری زبان میں ایک افسانوی مجموعہ ''علم'' 2007ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ڈراموں کے دو مجموعے ''دن'' اور ''انسان'' بھی شائع کیے۔

ورندر پٹواری کے افسانے زندگی کے مختلف رنگوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کشمیری ماحول، آب وہوا، رسم ورواج اور وہاں کے مسائل کا ذکر ملتا ہے جسے انھوں نے بخوبی پیش کیا ہے۔

مالک رام آنند نے افسانوں کے علاوہ ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے ''شہر کی خوشبو'' اور ''تصور کے پھول'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومانیت اور حقیقت نگاری کا عنصر موجود ہے۔

اس کے علاوہ انسانی دوستی اور اخلاقیات کا ذکر بھی ان کی کہانیوں میں جا بجا ملتا ہے۔ رومانیت اور ترقی پسند ادب سے متاثر تھے۔ اس لیے ان کی کہانیوں میں متوسط طبقے کی محرومیاں، کسانوں کی بے بسی، بھونڈی رسمیں اور مزدوروں کے استحصال کے موضوعات ہیں۔

شبنم قیوم نے دو افسانوی مجموعے ''ایک زخم اور سہی'' (1971ء) اور ''نشانات'' (2007ء) کے چار ناول ''یہ کس کا لہو کون ہے میرا''، ''جس دیش میں جہلم بہتا ہے''، ''زندگی اور موت'' اور ''چراغ کا اندھیرا'' شائع کیے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو کہانیوں کے ذریعے پیش کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے وہاں کے دفتری نظام، کشمیر سے جموں منتقل کرنے کا ذکر بھی افسانے ''دیا جلاؤ، روشنی بجھاؤ'' میں کیا ہے۔

عمر مجید کا ایک افسانوی مجموعہ ''اجالوں کے گھاؤ'' (1967ء) میں شائع ہوا۔ ان کی کہانیوں کو بعنوان ''عمر مجید کے بہترین افسانے'' 2009ء میں ترتیب دے کر شائع کیا۔ ان کے دو ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' اور ''درد کا دریا'' شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے افسانوں کے موضوع، کردار کشمیر کے اردگرد ہی گھومتے ہیں۔ وادی کے ماحول نے مجید کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ وہاں کے دکھ درد، غربت، امن پسندی نے ان کو بہت متاثر کیا۔ اس تعلق سے نور شاہ لکھتے ہیں:

> ''محمد مجید کے افسانوں کا ایک الگ ہی انداز ہے۔ وہ افسانے لکھنے کے ڈھنگ سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ اپنے کردار، زمین کی کھردری سطح پر تلاش کرتے ہیں اور چن کر اپنے افسانوں میں قید کر لیتے ہیں۔ اسلوب کا ستھرا پن ان کی کہانیوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ کشمیر، کشمیریت اور کشمیر کی زندگی ان کے محبوب ترین موضوعات ہیں۔''(11)

پروفیسر ظہور الدین ایک افسانہ نگار کے علاوہ محقق، نقاد، مفکر، شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ترقی پسند اردو افسانے کی عظمت کا خیال رکھا بلکہ جدیدیت کے روشن اور مثبت پہلو کا بھی خیر مقدم کیا۔ چنانچہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''تلافی'' اور دوسرا افسانوی مجموعہ ''کینی بلز'' میں شامل زیادہ تر افسانے علامتی نوعیت کے ہیں۔ انھوں نے جدیدیت کی اندھی تقلید نہیں کی بلکہ قاری کی ذہنی بالیدگی ملحوظ نظر رکھا۔ برج پریمی ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اردو افسانہ ریاست میں کسی جمود کا شکار نہیں۔ یہاں کے کہانی کار
اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں اور
عصر حاضر کے انسان میں بے سروسامانی، کرب اور تنہائی کا احساس پیدا
ہوا ہے، اس کی ترجمانی جدید دور کے افسانہ نگار کر رہے ہیں۔''(12)

واقعی جب ہم ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانہ نگاری کے حوالے سے شروعاتی دور سے آج تک کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی زرخیز مٹی نے ہر دور میں ایسے فنکار پیدا کیے جو کسی ایک نظریئے یا تاثر میں الجھے نہیں رہے بلکہ ہر دور میں وہاں کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا نہ صرف اندازہ ہوتا ہے بلکہ ہو بہو نقشہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے روایتی، رومانی، ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت یعنی کہ ہر انداز کے افسانے اپنی فنکارانہ مہارت سے پیش کیا۔ آزادی سے پہلے وہاں کا شخصی راج اس کے بعد ملک کا بٹوارہ اور آزادی یعنی کہ ہر طرح کے حالات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ جو لوگ پہلے رومانوی طرز کے افسانے لکھتے تھے ترقی پسند سے متاثر ہو کر روایت سے انحراف کیا۔ اس کے بعد خارجی اور معروضی، موضوعی اور داخلی، علامتی اور تجریدی افسانے بھی لکھے گئے یعنی کہ جس طرح حالات بدلتے گئے افسانہ بھی اپنے انداز بدلتا رہا۔ اسی طرح جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے زیر اثر بھی افسانے لکھے گئے۔ جو لوگ پہلے سے لکھ رہے تھے انھوں نے بھی جدید اور مابعد جدید نظریات کو اپنایا لیکن ان کے علاوہ کئی اور نئے لوگ بھی افسانہ نگاری کے میدان میں آئے۔ ان کی ایک طویل فہرست ہے، جن میں آنند لہر، انیس ہمدانی، غمگین غلام نبی، سومناتھ ڈوگرہ، راجہ بونیازی، مسعود ساہو، جان محمد آزاد، زاہد مختار، کے ڈی مینی، اشرف آثاری، یاسین فردوسی، عبدالرشید فراق، غلام رسول آزاد، وحشی سید ساحل، اشوک پٹواری، مشتاق مہدی، زاہد مختار، حمید اللہ بٹ کے علاوہ خالد حسین، بلراج بخشی، بصیرت احمد قریشی المروف امین بنجارہ، اوم پرکاش، جسونت منہاس وغیرہ کے علاوہ اور بھی کئی لوگ ہیں۔ جموں وکشمیر میں خواتین افسانہ نگار بھی پیچھے نہیں ہیں۔ انھوں نے افسانے کے علاوہ دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان میں خاص طور سے واجدہ تبسم، نعیمہ احمد مہجور، ترنم ریاض، زنفر کھوکھر، نیلوفر ناز نحوی کے علاوہ منظورہ اختر، شہزادی رینہ شاہین، نذیر شہباز، روحی شال، نسرین نقاش کے علاوہ ڈاکٹر نصرت چودھری اور ایم النسا کے نام بھی سرفہرست ہیں۔

ان تمام خواتین وحضرات نے عمدہ افسانے لکھے ہیں۔انھوں نے موجودہ دور کے تمام سیاسی، سماجی، اقتصادی حالات کو بخوبی فنکارانہ انداز میں اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔اس ضمن میں ان لوگوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔ان میں آنند لہر نے افسانوں کے علاوہ ناول اور ڈرامے بھی لکھے۔ان کے پانچ افسانوی مجموعے ''بٹوارہ''، ''انحراف''، ''کورٹ مارشل''، ''سرحد کے اس پار'' اور ''سریشٹھ نے بھی یہی لکھا ہے'' منظر عام پر آئے ہیں۔آنند لہر نے تجریدی اور علامتی افسانے بھی لکھے ہیں۔ان کا مشاہدہ اور مطالعہ بہت گہرا ہے۔انھوں نے سماج کے اکثر ایسے مسائل پر قلم اٹھایا ہے جس سے عام لوگوں دوچار ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے ہجرت، سرحد کے علاوہ عورتوں کے مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

خالد حسین کے ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھنواں''، ''اشتہاروں والی حویلی'' اور ''ستی سرکا سورج'' افسانوی مجموعے ہیں۔ان کے بیشتر افسانوں میں معصوم لوگوں کا قتل، انسانوں کی عیاری ومکاری کے علاوہ مرد وزن کے بے میل رشتوں کے باعث جنسی بے راہ روی اور الجھنوں کا بیان ملتا ہے۔

نصیر احمد قریشی المعروف امین بنجارہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب، ادب نوازی، عالمانہ بصیرت، ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ وہ افسانہ نگار ہونے کے علاوہ محقق، نقاد اور مبصر بھی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''الاؤ'' 1955ء میں شائع ہوا۔ان کے افسانوں میں حب الوطنی، انسانی اقدار کی عظمت کے علاوہ معاشرتی برائیوں کا ذکر بھی خوب ملتا ہے۔

دیپک بدکی کے چار افسانوی مجموعے ''ادھورے چہرے''، ''چنار کے پنجے''، ''زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'' اور ''ریزہ ریزہ حیات'' شائع ہو چکے ہیں۔انھوں نے سماج میں پھیلی برائیوں کو اجاگر کیا ہے۔ان کے افسانے نہ صرف کشمیر بلکہ پورے ہندوستان کی تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔انھوں نے افسانوں میں کشمیری کہاوتوں کا بھی بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے جب زیور ہوتے ہیں تو کان نہیں ہوتے اور جب کان ہوتے ہیں تو زیور نہیں ہوتے۔''(13)

اس کے علاوہ بدکی نے کشمیر کے دیگر موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔

ترنم ریاض کا نام جموں وکشمیر کی نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔اس کے علاوہ وہ شاعری بھی کرتی ہیں۔ان کا شعری مجموعہ ''پرانی کتابوں کی خوشبو'' 2005ء میں شائع ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ دو کتابیں ''بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب'' (2005ء)، تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''چشم نقش قدم''(2005ء)، چار ناولٹ بعنوان ''فریب خطہ گل'' میں شامل ہیں۔ دو ناول ''مورتی'' اور ''برف آشنا پرندے'' وغیرہ۔ریاستی اردوادب میں ان کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔

ان کے چار افسانوی مجموعے ''یہ تنگ زمین''، ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی''، ''میرا رخت سفر'' اور ''یمبر زل'' قابل ذکر ہیں۔ان کا تعلق کشمیر سے ہے لیکن اب مستقل طور پر دہلی میں سکونت اختیار کر چکی ہیں۔ تاہم ان کے افسانے کشمیر اور کشمیری ثقافت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ نئی نسل کے لوگ بھی نہ صرف افسانہ بلکہ دیگر اصناف میں بھی ذوق وشوق کے ساتھ طبع آزمائی کر رہے ہیں۔خاص کر شاعری میں تو ایک طویل فہرست ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ فکشن اور خاص طور سے افسانے بھی لکھ رہے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں وادی کشمیر، خطہ پیر پنچال کے علاوہ خطہ چناب کی سرزمین بھی اردو زبان و ادب کے لیے عرصہ دراز سے زرخیز رہی ہے۔ضلع ڈوڈہ، ضلع کشتواڑ اور ضلع رام بن خطہ چناب میں دائرے میں آتے ہیں۔وہاں نہ صرف اسکولوں اور کالجوں میں اردو زبان وادب کی تعلیم دی جاتی ہے بلکہ روایتاً گھر میں جب بچہ گنتی سیکھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اسے اردو کے حروف تہجی سے بھی آشنا کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ وہاں کے لوگ بھی زبان اور شاعری سے شغف رکھتے ہیں۔خاص طور سے شاعری اور نہ صرف اردو بلکہ وہ لوگ اپنی علاقائی زبان میں بھی شاعری کرتے ہیں۔ بھدرواہی، کشمیری، پہاڑی، گوجری وغیرہ خاص طور سے۔ان شاعروں کی تو ایک طویل فہرست ہے لیکن جہاں تک فکشن اور خاص طور سے اردو افسانہ نگاری کا تعلق ہے 1960ء کی دہائی میں وہاں افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔عشرت کاشمیری جو ایک مؤرخ ہونے کے علاوہ افسانہ نگار بھی تھے۔انھوں نے افسانے لکھے لیکن یہ افسانے منظر عام پر نہیں آئے۔ساغر صحرائی کے مطابق بھدرواہ کے غلام رسول اور ماسٹر غلام علی کیلو نے افسانے لکھے۔

خطہ کشتواڑ کے افسانہ نگاروں میں عشرت کاشمیری کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے علاوہ الطاف کشتواڑی، عبدالرشید فدا، اسلم شہزاد، طارق تمکین، عشاق کشتواڑی، بشیر احمد بشیر اور پرویز ابن طیب وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ رام بن کے افسانہ نگاروں کی فہرست یوں ہے: صورت سنگھ، مرحوم عبدالرحمٰن رونیال، عبداللطیف (نمائی) اور عبدالخالق غنی اور بانیہال سے بہار احمد بہار بانہالی، ڈاکٹر خالد رسول، بشیر بانہالی، ظاہر بانہالی اور فردوس ابن منشور بانہالی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

بھدرواہ جسے وہاں کی قدرتی خوبصورتی کی بنا پر ''چھوٹا کشمیر'' کہا جاتا ہے۔ بھدرواہی اور کشمیری وہاں کی خاص زبانیں ہیں۔ وہاں شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن ساتھ ہی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی ہوتی رہی ہے۔ جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے وہاں کے افسانہ نگاروں میں طالب حسین رند بھدرواہی، ڈاکٹر عبدالمجید بٹ، مرحوم پروفیسر عبدالرحیم مغل، مرحوم شاذ شرقی، مرحوم عبدالمجید راز، جسونت منہاس، مرحوم علی محمد شاد، سنوتر دیو کوتوال، مرحوم غلام رسول ملک، ڈاکٹر محمد اقبال زرگر، سعادت علی کیلو، نوین کمار کوتوال، نیک چند کوتوال اور ساغر صحرائی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان میں جن لوگوں کے افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے ہیں وہ بھی قابل ذکر ہیں۔

طالب حسین رند بھدرواہی، مرحوم شاذ شرقی، جسونت منہاس، سنوتر دیو کوتوال۔

طالب حسین رند بھدرواہی کی ابتدائی کاوشوں میں ''ہم ولی ہو گئے''، ''کنویں سے جھیل تک''

ڈاکٹر عبدالمجید نے افسانچے اور افسانے تحریر کیے جن میں ''جلا گلاب''، ''تلاش''، ''آپ بیتی'' اور ''روزمنی آرڈر'' قابل ذکر ہیں۔

شاذ شرقی کی ابتدائی کاوشوں میں ''غریب اور مکھیاں''، ''میری تنہائی'' کے علاوہ ''سنہری بال'' اور ''ہماری بیگم'' قابل ذکر ہیں۔

سنوتر دیو کوتوال کا افسانوی مجموعہ ''جام'' کے نام سے چھپا۔ ان کے علاوہ جسونت منہاس کے چار افسانوی مجموعے ''توجہ''، ''مسکراتے ناسور''، ''یادیں'' اور ''کم ظرف'' شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر محمد اسداللہ وانی نے افسانہ نگاری کی شروعات ''ادھورے تاج محل''، ''انتظار کا قیدی''، ''انتظار'' اور ''توی نے کہا'' وغیرہ سے کی۔

اس کے علاوہ علاقہ بھلیسہ سے سرمت سروال اور عبدالرشید دو خاص نام ہیں۔ ان تمام لوگوں نے معاشی، اقتصادی انتشار، فرد کی تنہائی، اخلاقی قدروں کی پامالی، خودکشی، جنسی استحصال، انسان کی محرومیاں، رشوت خوری، فرقہ پرستی کی آگ کے شکار نوجوان، معاشرے میں جہیز کا رواج و دیگر سماجی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

برج پریمی نے ایک جگہ لکھا ہے: ''اگر چہ ان افسانہ نگاروں کے تجربوں میں وہ وسعت نہیں ہے، جو ان کے پیش روؤں میں موجود تھی۔''(14)

یہ بات صحیح ہے کہ بعد کے افسانہ نگاروں کے یہاں وہ وسعت اور گہرائی نہیں ہے جو پہلے کے فنکاروں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر کوئی منٹو، کرشن چندر یا بیدی نہیں بن سکتا۔ پھر بھی ان کے افسانوں میں کہانی پن ضرور ہے اور ان فنکاروں نے موجودہ عہد کے حالات سے متاثر ہو کر کئی ایسی کہانیاں لکھی ہیں جو بلاشبہ ہمارے سماج کی عکاسی کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ وہاں کے فنکاروں کو اپنی تخلیقات کو منظر عام پر لانے کے لیے وہ سہولیات دستیاب نہیں جو ملک کے دیگر علاقوں کے فنکاروں کو ہے۔ یہ آج کا نہیں بلکہ پہلے سے ہی ریاست کے فنکاروں کا مسئلہ رہا ہے۔ بیشتر فنکاروں نے کئی کہانیاں لکھی ہیں لیکن ان کے مجموعے شائع نہیں ہو سکے اور آج اس ترقی کے باوجود بھی یہ مسئلہ افسانہ نگاروں کے ساتھ درپیش ہے۔ اس کے علاوہ کئی افسانہ نگاروں کے مجموعے ایک بار شائع ہوئے ہیں لیکن آج وہ نایاب ہیں۔ حالانکہ ریاستی کلچرل اکادمی، دیگر ادارے اور کچھ لوگ اردو زبان و ادب کی خدمات میں ہمہ تن لگے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی اس میں کوئی خاص بہتری اور ترقی نہیں ہوئی ہے۔ کہیں تو چوک ہو رہی ہے۔ جہاں تک میرا ماننا ہے ریاستی کلچرل اکادمی، ادبی اداروں کے علاوہ، ادبی رضا کاروں کو شعوری طور پر ذمہ دارانہ رویہ اپنانا ہوگا اور ریاست کے نوخیز فنکاروں بنیادی سہولیات فراہم کرانا ہوں گی جن سے وہ فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تخلیقات کو منظر عام پر لا سکیں۔ اس کے لیے ان کو ریاست کے علاوہ ملک کے دیگر فنکاروں

اورادب شناسوں سے صلاح اورحکومت سے پوری امداد لینی چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ آنے والے وقت میں ملک کے دیگر حصوں کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر میں نئے فنکار ابھر کر سامنے آئیں گے اوراس برسوں کی روایت زندہ اورتابندہ رہے گی۔

☆☆☆

حواشی:

(1) پریم ناتھ پردیسی، بہتے چراغ، کشمیر: بروکار پریس، 1955ء، ص:14

(2) ایضاً۔ص:16

(3) ایضاً۔ص:157

(4) ایضاً،ص:163

(5) برج پریمی، جموں کشمیر میں اردوادب کی نشوونما، کشمیر: دیپ پبلی کیشنز، 1992ء، ص:29

(6) پریم ناتھ در، کاغذ کا واسدیو، پیش لفظ

(7) پریم ناتھ در، نیلی آنکھیں، کشمیر: فنکار کلچرل آرگنائزیشن، سری نگر، 1991ء، ص:27-26

(8) پریم ناتھ در، چناروں کے سائے میں، کشمیر: فنکار کلچرل آرگنائزیشن، سری نگر، 1991ء، ص:6

(9) موہن یاور، دو کنارے، جموں: کلدیپ بک سنٹر، جموں توی، 1962ء، ص:92

(10) برج پریمی، جموں کشمیر میں اردوادب کی نشوونما، کشمیر: دیپ پبلی کیشنز، 1992ء، ص:40

(11) سلیم سالک، (مرتبہ) عمر مجید کے بہترین افسانے، سری نگر: میزان پبلشرز، 2009ء، ص:27

(12) برج پریمی، جموں کشمیر میں اردوادب کی نشوونما، کشمیر: دیپ پبلی کیشنز، 1992ء، ص:38

(13) دیپک بدکی، ریزہ ریزہ حیات، سری نگر: میزان پبلی کیشنز، 2011ء، ص:127

(14) برج پریمی، جموں کشمیر میں اردوادب کی نشوونما، کشمیر: دیپ پبلی کیشنز، 1992ء، ص:38

(ب)

آنند لہر کی افسانہ نگاری: ایک تفصیلی ایک جائزہ

عالمی ادب کی طرح اردو ادب میں بھی وقت بے وقت تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ ادب کو سماج کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ جیسے جیسے سماج میں تبدیلیاں ہوتی رہیں ادب نے انھیں قبول کیا اور ادیبوں اور فنکاروں نے اپنی فنکارانہ بصیرت کے مطابق ان حالات کو اپنی تخلیقات کے ذریعے پیش کیا۔ ملک کی آزادی تقسیم سے لے کر آج تک ہمارے یہاں سماجی، سیاسی سطح پر کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اگر ادبی صورت حال دیکھیں تو رومانی، حقیقت پسندی، ترقی پسندی اور جدیدیت یا پھر مابعد جدیدیت ادیب و فنکار نے تحریک سے رجحان سے متاثر ہو کر شاعری و نثر یعنی کہ ادب تخلیق کیا۔ افسانہ نگاری اردو ادب کی سب سے نئی صنف ہے۔ پریم چند، سجاد حیدر یلدرم سے لے کر آج تک اردو افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے اس وقت کے حالات کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ جہاں تک ریاست جموں و کشمیر کا تعلق ہے اگر چہ وہاں اردو افسانے کا آغاز تاخیر سے ہوا لیکن وہاں بھی شروع سے لے کر آج تک متعدد افسانہ نگاروں نے افسانہ نگاری کے میدان میں طبع آزمائی کی۔ پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در کے بعد ٹھاکر پونچھی اور کرشن چندر جیسے تخلیق کاروں سیاست جموں و کشمیر کی تہذیب و ثقافت کے علاوہ سیاسی و سماجی کو حالات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور آج بھی یہ روایت برقرار ہے۔ اگر چہ وہاں فنکاروں کو سہولیات دستیاب نہیں لیکن اس کے باوجود بھی متعدد افسانہ نگار فن افسانہ نگاری کے میدان میں ذوق و شوق کے ساتھ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جن کی فہرست طویل ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں آنند لہر کا نام اہم ہے۔

آنند لہر بنیادی طور پر ہائی کورٹ کے سینئر وکیل ہیں۔ شیام سندر کے نام سے جانے جاتے ہیں اور اردو دنیا میں آنند لہر کے نام سے مشہور ہیں۔ آنند اپنی ذاتی مصروفیات کے باوجود بھی اردو ادب سے دلچسپی

رکھتے ہیں۔اس کا ثبوت ان کی تخلیقات ہیں جو سامنے ہیں۔آج تک آنندلہر نے پانچ افسانوی مجموعے، پانچ ناول اور تین ڈرامے تخلیق کیے ہیں۔ یہ ان کے ادبی ذوق کی دلیل ہے اور ملک و ریاست کی اکادمیوں کے علاوہ دیگر اداروں نے بھی ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر ان کو اعزازات و انعامات سے بھی نوازا ہے۔ ہمارا موضوع آنندلہر کی افسانہ نگاری یعنی آنندلہر بحیثیت افسانہ نگار ہے۔

آنندلہر نے پانچ افسانوی مجموعے تخلیق کیے ہیں:

1- ''انحراف''1975 میں پہلی بار شائع ہوا اور دوسری اشاعت 2002 میں ہوئی۔

2- ''سرحد کے اس پار''2001 میں شائع ہوا۔

3- ''کورٹ مارشل''2006 میں شائع میں ہوا۔

4- ''بٹوارہ''2009 میں شائع ہوا۔

5- ''سریشٹہ نے بھی یہی لکھا ہے''2015 میں شائع ہوا۔

پہلا افسانوی مجموعہ ''انحراف''1975 میں پہلی بار شائع ہوا اور اس کے بعد 2002 میں دوسری اس کی اشاعت ہوئی۔اس میں کل اکتیس افسانے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(1) سولہواں برس۔(2) راستے کا پہاڑ۔(3) وجود۔ (4) سفر۔(5) جواب۔(6) پانی کی لکیر۔ (7) دائرہ۔ (8) زندگی کے زخم۔ (9) اندھیری روشنی۔ (10) الجھن۔ (11) بے چہرہ لوگ۔ (12) ریت کا چشمہ۔ (13) سورج کا قتل۔ (14) گولائی۔ (15) نروان۔ (16) قیدی۔ (17) لمحے۔ (18) بے معنی صدا۔ (19) وجود کی جنگ۔ (20) بکھرے الفاظ۔ (21) اندھی لکیریں۔ (22) گھر (23) زاویے۔ (24) عمر۔ (25) سراب۔ (26) بے بس لوگ (27) الفاظ (28) چیخ۔ (29) پڑوسی۔ (30) رفتار۔ (31) سڑک۔

افسانوی مجموعہ ''انحراف'' آنندلہر کی ایک منفرد پیشکش ہے۔انحراف میں آنندلہر نے روایتی افسانے نہیں لکھے بلکہ تجریدی اور تمثیلی افسانے لکھے ہیں۔ان افسانوں کو روایتی افسانوں سے بغاوت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ واقعی یہ تجریدی افسانے ہیں چونکہ روایتی افسانوں سے الگ ہیں۔مطلب کی بات ان میں براہ راست

نہیں کہی گئی ہیں۔ یہ افسانے Abtract ضرور ہیں لیکن زندگی کی تلخیاں ان میں موجود ہیں۔ عام قاری ان افسانوں کو نہیں سمجھ سکتا بلکہ باشعور قاری ہی ''انحراف'' کے افسانوں کو سمجھ کر لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس میں آنند لہر نے علامتی اور استعاراتی انداز اپنایا ہے۔ ان افسانوں میں انسانی رشتوں، سماجی رابطوں اور اخلاقی قدروں کو آنند لہر نے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ افسانے مختصر ہیں لیکن مختصر ہوتے ہوئے بھی زندگی پر محیط ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں تجریدی اور علامتی افسانے لکھنے والوں میں آنند لہر کا سرفہرست ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''انحراف'' اسی زمرے میں آتا ہے۔ آنند لہر نے اپنے افسانوں میں خواب آور کیفیات کو ابھارا ہے۔ بقول نصرت چودھری:

> ''لہر کے یہاں زیادہ تر اینٹی اور تجریدی کہانیاں ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں بغیر پلاٹ اور کرداروں کے خواب آور کیفیت ابھارا ہے۔ نئے افسانوں میں جہاں موضوعاتی سطح پر زندگی کی بے معنویت، معاشی ناہمواری طبقاتی افسانے کے فن میں کئی تجربے بھی ہوئے ہیں۔ نئے افسانے میں کہانی پن، پلاٹ اور کرداروں کے قطع نظر اینٹی پلاٹ اور اینٹی کہانی کی جھلک ملتی ہے۔ نئے تجریدی افسانوں کی تکنیک اور ہیئت روایتی افسانوں سے قدرے مختلف ہے۔ آنند لہر کے یہاں زیادہ تر یہی انداز کارفرما ہے۔ ان کے افسانوں میں واقعات کی ترتیب، پلاٹ کی تعمیر اور کرداروں کے روایتی ارتقا کے بجائے، منتشر خیالات، واقعات کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔ جس طرح خواب میں ہم زماں و مکاں کی حدود سے ماورا ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح ''انحراف'' کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے خواب کے سے عمل کے تحت زمانی و مکانی حدود کے بجائے واقعات کا ایک منتشر عمل سامع آتا ہے۔ ان کے افسانے سڑک، عدالت، رفتار، راستے کا پہاڑ اور وجود تجریدی افسانے کے اعلیٰ نمونے کہے جاسکتے ہیں۔''(1)

واقعی آنند لہر کے افسانوی مجموعے ''انحراف'' میں تجریدی کہانیاں ہیں۔ انھوں نے اس میں بغیر

پلاٹ اور کردار کے چھوٹی چھوٹی لیکن زندگی پر مبنی کہانیاں لکھی ہیں۔ان کہانیوں میں تکنیک اور ہیئت روایتی افسانوں سے مختلف ہیں اور منتشر خیالات و واقعات کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔ یہ آنند لہر کی افسانہ نگاری کا شروعاتی دور تھا جس میں انھوں نے تجریدی افسانے لکھے ہیں۔اسیر کشتواڑی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''انحراف،لہر صاحب کے تجریدی افسانوں کا ایک مرقع ہے جو پڑھنے اور غور کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔مصنف کا ہنر اور اس کی کامیابی ورق در ورق،سطر در سطر،لفظ لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔یہی وہ خصوصیات ہیں جو لہر کو ادبی دنیا میں ایک منفرد اور بلند مقام دلانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔''(2)

ان افسانوں میں وہ،اس نے، کے علاوہ الف، ب،س وغیرہ کردار ہیں۔آنند لہر نے مختصر افسانوں میں دنیا، زمین و زماں، انسان و حیواں ن، چرند و پرند، ہوا، آسمان، بارش اور سورج غرض کہ انسانی ماحول میں موجود ہر چھوٹی بڑی چیز کا انھوں نے گہرائی سے مشاہدہ اور غور و فکر کیا ہے۔ زبان و بیان عام فہم ہے لیکن اشاروں اور کنایوں میں بھی بات کی گئی ہے اس لیے قاری کو افسانے کی روح تک پہنچنے کے لیے غور و خوض سے کام لینا پڑتا ہے۔ان کا ایک افسانہ جو بہت ہی مختصر ہے ''ریت کا چشمہ'' اس میں انھوں نے اس دنیا کی بے ثباتی کو تجریدی اور تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔صرف ایک پیراگراف افسانہ ہے لیکن دنیا کی بے ثباتی کو اس میں بخوبی پیش کیا ہے۔مجموعی طور پر یہ افسانے اردو ادب میں گراں قدر اضافے ہیں۔

''سرحد کے اس پار'' آنند لہر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے 2001 میں سیمانت پرکاشن دریا گنج نئی دہلی سے شائع ہوا۔ یہ افسانوی مجموعہ چودہ افسانوں پر مشتمل ہے۔وہ ہیں:

1- سرحد کے اس پار	2- رنگ ساز	3-سپیرن	4-گوری
5- شکست	6- واپسی	7- رشتے	8- چھوٹی سی آواز
9- پھول والی	10- زندگی	11- منو	12- تندور
13- جسم بستی	14- بنجارن		

آنند لہر نے ان افسانوں میں سماجی، سیاسی مسائل کو فنکارانہ انداز میں بخوبی پیش کیا ہے۔آنند لہر کسی

ایک نظریے یا فنکار سے نہیں بلکہ کئی فنکاروں سے متاثر تھے۔اس لیے ان کے یہاں تقریباً ہر طرح کے افسانے ملتے ہیں۔شرون کمار ''سرحد کے اس پار'' کے پیش لفظ میں ان کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''وہ کسی ازم یا تحریک سے جڑا کہانی کار تو نہیں ہے اور یہ اس کے فن کے فن میں بہتری ہے۔لیکن افسانے کی روایت جمالیاتی حس اور فنی باریکیوں سے رشتہ استوار کیے ہوئے ہے۔وہ ان معنوں میں ترقی پسند ہے کہ انسان کا بھلا چاہتا ہے۔اس کے لیے وہ نعرہ نہیں لگاتا، قاری کی زندگی کی کڑواہتوں، صعوبتوں اور مشکلوں سے آگاہ کرتا چلتا ہے اور اسے ان حالات کو بدلنے اور سوچنے پر آمادہ کرتا ہے۔اس لحاظ سے وہ کسی نہ کسی جگہ منشی پریم چند کی روایت سے جڑا رہتا ہے اور یہ تقلید نہ ہو کر پاسداری ہے۔وہ نہ تو جذباتی ہو کر بہکتا ہے اور نہ صرف پاسبان عقل کے سایہ میں تھم تھم کر چلتا ہے۔وہ قلم کی خدمت اور لفظ کی آبرو و عظمت کو پہچانتا ہے اس لیے ان سے کھلواڑ نہیں کرتا۔کم الفاظ میں بات کہنے کا ہنر کم لوگ جانتے ہیں۔''(3)

آنند لہر نے اگر چہ تحریری افسانوں سے اپنی افسانہ نگاری کی شروعات کی لیکن اس کے بعد انھوں نے مختلف قسم کی کہانیاں جو مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔وہ اس لیے کہ آنند لہر نے جس دور میں کہانی لکھنا شروع کیا اس وقت انسانی زندگی کی افراتفری، شک وشبہ، بدلتے ہوئے انسانی اور سماجی رشتوں، اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت، احیائے مذہب، سائنسی اور تکنیکی ترقی کے باوجود انسانیت کا زوال عام تھا۔اس لیے آنند لہر کی کہانیوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔آنند لہر حالات کا ماتم نہیں کرتے بلکہ انھیں خوش اسلوبی سے نپٹتے اور انھیں بدلنے کی بات کرتے ہیں۔ان کی کہانیاں روزمرہ کی زندگی اور انسان کو پیش آنے والے حادثات اور مشکلات کا احاطہ کرتی ہیں۔۔

''کورٹ مارشل'' آنند لہر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔2005 میں مانوی پرکاشن پنچ تیرتھی جموں سے شائع ہوا۔یہ افسانوی مجموعہ 22 افسانوں پر مشتمل ہے جو درج ذیل ہیں:

(1)اب تھانہ چل پڑے گا۔ (2)دادی اماں۔ (3)کورٹ مارشل۔ (4) سپاہی۔(5)دعا (6)سنہرا کفن۔(7)کھیر۔ (8)گواہوں کا بیوپاری۔(9)چند لمحے۔ (10)ویشیا۔(11)برف اب بھی سفید ہے۔ (12)گوتم بدھ سڑک۔ (13)صرف ایک آدمی۔(14) کرائے کا مریض۔ (15) اگر ایسا ہوتا۔ (16)خالی ہاتھ۔ (17)ٹھنڈہ چہرہ۔(18)فائر بریگیڈ۔(19)تیروں کا کھیل۔(20)تیاگ۔ (21)ایک خبر۔ (22)انسان کب جیتے گا۔

یہ تمام کہانیاں ہمارے سماج کی حقیقت بیان کرتی ہیں جسے آنند لہر نے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔پہلی کہانی ''اب تھانہ چل پڑے گا'' جس میں ایک ایسے گاؤں کو دکھایا گیا ہے جہاں پہلے امن وامان تھا لیکن وہاں بعد میں پولیس چوکی اور پھر تھانہ قائم کیا جاتا ہے۔اس کے بعد وہاں ہر قسم کے جرم ہونے لگتے ہیں اور جو قانون کے محافظ تھے وہی اپنے ہاتھوں میں قانون لے لیتے ہیں۔اس طرح وہاں کا امن وسکون ختم ہو گیا اور ابتری پھیل گئی۔وہاں پولیس ہیڈ کواٹر بنائے گئے لیکن وہاں کے نوجوان پھر بھی جرم کرنے لگے اور وہاں کے عوام کو حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے ان کو رشوت دینی پڑتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک لڑکی جو مر گئی تھی اس کو سرکاری ریکارڈ میں لکھنے کے لیے پولیس نے اس کے کفن کی رشوت لی اور اس کے بعد وہاں ایسا ہی ہونے لگا۔

آنند لہر نے ہمارے سماج میں ہونے والے روزمرہ واقعات کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا چونکہ وہ ایک وکیل ہیں۔اس لیے ان کا مطالعہ ومشاہدہ وسیع ہے۔انھوں نے خیالی چیزوں کو بالائے طاق رکھ کر روزمرہ کے واقعات کو پیش کیا۔ ہمارے سماج میں رشوت خوری اب عام ہو گئی ہے، ہر چھوٹا بڑا سرکاری ملازم یا پھر دیگر اہلکار بغیر رشوت کے کوئی کام نہیں کرتا اس لیے غریب لوگ اور غریب ہو رہے ہیں اور امیر لوگ اور امیر۔

اسی طرح آنند لہر نے دیگر سماجی مسائل کو بھی افسانوں کے ذریعے پیش کیا ہے جو توجہ طلب ہیں۔ آنند لہر کا چوتھا افسانوی ''بٹوارہ'' 2009 میں اردو بک سوسائٹی کوچہ روہیلا خان دریا گنج، نئی دہلی سے شائع ہوا۔ 34 کہانیوں پر مشتمل یہ مجموعہ جس میں مختلف موضوعات کو آنند لہر نے ان افسانوں میں پیش کیا ہے۔افسانے درج ہیں:

(1) بٹوارہ۔(2) دادی ماں۔(3) سمندر کا پانی۔(4) موسم بدلتے رہتے ہیں۔(5) پھیکے آم۔ 6) رانی، رانی غم خوار۔(7) دوسری بے انصافی۔(8) سنہری مچھلی۔(9) تھوڑی سی غلطی۔(10) حساب جیومیٹری۔(11) ایک داغ۔(12) یہ سرحدیں۔(13) انصاف۔ (15) وہ کدھر جائے۔(16) دوسرا بٹوارہ۔(17) جج صاحب۔ (18) ہتھیار۔ (19) اس نے سوچا۔ (20) کلفیاں۔(21) عشق کی ہار۔(22) سوال۔(23) سونامی۔(24) اور انتظار۔ (25) ان کے بچے۔(26) ہار کی جیت۔ (27) بیراگن۔ (28) درمیان میں وہ۔(29) تپسیا۔(30) لوگ لوگ ہیں۔(31) گھر۔(32) زمین کی ضرورت۔(33) دوسری سوچ (34) ایک اور ہجرت۔

آنند لہر نے اس افسانوی مجموعے میں زندگی کے حقائق کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے اور اس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

اشرف حسین کے مطابق:

> ''افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' دراصل زندگی کی تلخ سچائیوں کی بھرپور ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔ اور اس عمل میں وہ بے حد کامیاب ہے۔ اللہ تعالیٰ آنند لہر کو اپنے فن کی طرف مزید توجہ دینے کی فرصت عطا کرے اور قلم میں وہ طاقت دے تا کہ صفحۂ رنگینی کا کام چلتا رہے...آمین۔''(4)

اس مجموعے میں آنند لہر نے مختلف سماجی و سیاسی موضوعات کو افسانوں میں پیش کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ آنند لہر نے فلسفیانہ انداز میں ہر موضوع کو بیان کیا ہے۔

''سمندر کا پانی'' ایسے دو لوگوں کی کہانی ہے جن میں ایک بہت امیر ہے۔ اس کے پاس ہر چیز دستیاب ہے اور دوسرا آدمی جس کی حیثیت سماج میں اوسط درجے کی ہے۔ وہ بہت محنت کر کے اپنے گھر کی ضروریات کو پورا کرتا ہے لیکن بہت خوش رہتا ہے، اس کے بیوی بچے اس سے بہت پیار کرتے ہیں اور جب اس کو تکلیف ہوتی ہے تو اس کی بیوی اس کی بہت خدمت کرتی ہے اور بچے بھی پاس میں رہتے ہیں اور گاؤں والے بھی اس کی خدمت میں لگے رہتے ہیں لیکن وہ شخص جس کو ہر چیز دستیاب رہتی ہے، عیش و عشرت ہے اس کی بیوی اور بچے اس کی پرواہ نہیں کرتے اور اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور جب وہ بیمار ہوتا ہے تو نہ

اس کی بیوی خدمت کرتی ہے اور نہ بچے۔ بچے یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ پاپا کے پاس بہت پیسہ ہے اپنا علاج خود کرائیں گے اور یہاں تک کہ جب وہ اپنے نوکر سے پانی مانگتا ہے تو وہ بھی اس کی بات نہیں سنتا:

''اور گھنشام اکیلا بستر پر پڑا ہے۔ گھنشام نے نوکر سے کہا

''پانی لاؤ___''

''صاحب ابھی نلکا نہیں آیا ہے۔''

گھنشام نے محسوس کیا کہ سمندر کا پانی اس کے قریب ہونے کے باوجود

اس کے کام کا نہیں ہے۔''(5)

آنند لہر کا پانچواں افسانوی مجموعہ ''سریشٹھ نے بھی یہی لکھا ہے'' 2015 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے شائع ہوا جو 37 کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کی کہانیاں یوں ہیں:

(1) سریشٹھ نے یہی لکھا ہے۔ (2) دولہنیں۔ (3) دوسری بے انصافی۔ (4) بدلتے لفظ۔ (5) غلط علاج۔ (6) کئی رنگ۔ (7) سپیرے۔ (8) بدلتے رنگ۔ (9) الگ صوبہ۔ (10) انوکھے جسم (11) انوکھی دعا۔ (12) اور پتھر رو پڑا۔ (13) چھوٹے لوگ۔ (14) چڑیوں کی بارات۔ (15) سنہری جوتیاں۔ (16) تین دن کے بعد۔ (17) ووٹ بینک۔ (18) طلاق۔ (19) اس روز۔ (20) لالہ گورنام داس۔ (21) چناب کا پانی۔ (22) درخت بن رہا آدمی۔ (23) دو دوست۔ (24) دو پٹے۔ (25) انصاف۔ (26) کہانی۔ (27) موقع۔ (28) رام سنگھ کی خودکشی۔ (29) سڑک انصاف کرے گی۔ (30) زمین کی کوئی نہیں سنتا۔ (31) اچھا کام۔ (32) اپنا گھر۔ (33) بڑا آدمی۔ (34) صرف ایک شام سنگھ۔ (35) سورج گرہن۔ (36) تلاش۔ (37) تارو دیوی کے بازو۔

اس افسانوی مجموعے میں ہر افسانہ اپنی انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اخلاقی، تہذیبی قدروں کا زوال، انسانی امیدوں اور آرزوؤں کی بات، محبت کے درمیان خلیج کا معاملہ، خودغرضی اور انسانی استحصال وغیرہ دیگر سماجی مسائل کو آنند لہر نے بخوبی پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں آنند لہر نے روایتی بیانیہ اور تمثیلی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

''سریشٹھ نے بھی یہی لکھا ہے'' اس افسانوی مجموعے کی پہلی کہانی ہے اور اس کہانی کے مجموعے کا نام

بھی رکھا ہے۔اس کہانی میں آنند لہر نے دوملکوں کے سپاہیوں کی کہانی کو بخوبی پیش کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کسی بھی ملک کا عام آدمی جنگ نہیں چاہتا ہے اور اتنا ہی نہیں اس ملک کے سپاہی وہ بھی لڑائی نہیں چاہتے ہیں کیونکہ ان کا بھی گھر ہوتا ہے، والدین، بیوی بچے ہوتے ہیں، وہ بھی امن چاہتے ہیں۔ان کے والدین، ان کی بیوی ان سے کہتی ہیں کہ دوسرے ملک کے سپاہی کو بھی نقصان مت پہنچانا کیوں کہ ان کے بھی گھر میں بیوی بچے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔آنند لہر نے عام انسان کے ساتھ ساتھ ایک سپاہی کی نفسیات کا مشاہدہ بھی بہت اچھے انداز میں کیا ہے۔جب دونوں ملکوں کے سپاہی کو دوسرے ملک کا راز جاننے کے لیے بھیجا جاتا ہے تو وہ دونوں اپنی نجی باتیں وہاں کرتے ہیں اور اپنے گھر کے حالات کا ذکر بھی کرتے ہیں۔اپنے گھر والوں کی باتیں اور خیالات ایک دوسرے کو بتاتے ہیں۔جب ان کے گھر سے خط آتا ہے تو وہ ایک دوسرے کو دکھاتے ہیں اور پڑھ کر سناتے ہیں۔دونوں کے گھر کے حالات تقریباً یکساں ہی ہوتے ہیں اور اسی طرح جب دوسرا خط پڑھ کر سناتا ہے اور آخر میں کہتا ہے کہ ''سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے۔''

یہ ایک بہت ہی عمدہ کہانی ہے۔آنند لہر نے اپنے فنکارانہ صلاحیت سے اس کہانی میں نہ صرف دو سپاہیوں بلکہ دوملکوں کے حقایق کو کہانی میں پیش کیا ہے۔دونوں ملکوں یعنی کہ ہندستان اور پاکستان میں عام لوگوں کو حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ان کو اپنی روزمرہ کی زندگی اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔اس کے علاوہ سیاسی طور پر یہاں کے حالات ایسے ہیں کہ صرف عوام کا استحصال ہو رہا ہے۔نیتا لوگ بس اپنی سیاست چلا رہے ہیں۔

اس کے علاوہ دیگر افسانے بھی الگ الگ نوعیت کے ہیں جن میں آنند لہر نے اپنی فنکارانہ بصیرت سے سیاسی، سماجی، معاشی وغیرہ دیگر حالات کو پیش کیا ہے۔

یہ آنند لہر کے پانچ افسانوی مجموعے ہیں جن میں ان کے 138 افسانے شامل ہیں۔تقریباً ہر قسم کے افسانے ہیں: تجریدی، تمثیلی، بیانیہ اور روایتی وغیرہ۔

آنند لہر کسی ایک تحریک، رجحان یا نظریے سے متاثر نہیں تھے بلکہ انھوں نے رومانی، ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے متاثر ہو کر افسانے لکھے۔اس کے علاوہ آنند لہر کے مطابق وہ کرشن چندر، منٹو

اور بیدی سے بھی متاثر تھے۔

آنند لہر کی افسانوی خدمات کے پیش نظر انھیں ملک اور ریاست کے ادیبوں اور فنکاروں نے ان کے خوب سراہا ہے اور ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں مختلف آرائیں پیش کی ہیں جن کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ ریاست جموں وکشمیر کے ایک نامور محقق اور نقاد پروفیسر ظہور الدین لکھتے ہیں:

''آنند لہر ریاستی اردو فکشن پر ابھرتی ہوئی ایک نئی آواز ہے۔ سپریم کورٹ کے ایک نامور ایڈوکیٹ ہونے کے ناطے آپ کی مصروفیات کا جو عالم ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اس کے باوجود اپنی دلچسپیوں خصوصاً ناول کے لیے وہ کس طرح وقت نکال پاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے.... آنند لہر نے اس دور کے ہی نہیں بلکہ ہر دور کے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بڑے معروضی انداز میں پیش کیا ہے۔ آنند لہر کے پاس قدرت کی دی ہوئی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔''(6)

واقعی یہ پہلو غور کرنے کا ہے کہ ایک ایڈوکیٹ کو اپنی بہت ساری عدالتی مصروفیات ہوتی ہیں۔ دن بھر عدالت کا کام کرنا ہوتا ہے اور رات میں گھر آ کر دوسرے دن کی تیاری کے علاوہ دیگر ذمے داریاں بھی ہوتی ہیں لیکن ان تمام مصروفیات کے باوجود آنند لہر اردو فکشن میں دلچسپی رکھتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ یہ داد دینے کے قابل ہیں۔ اردو ادب کے ایک اور افسانہ نگار انور کمال پاشی، آنند لہر کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

''گذشتہ دہائی میں جن چند ناموں نے اپنے افسانوں سے اردو دنیا کو متوجہ کیا، ان میں ایک اہم نام آنند لہر کا ہے۔ موجودہ سیاسی اور سماجی نظام کی کمزوریوں کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جن لوگوں کو نئے اردو افسانوں میں کہانی پن کی تلاش ہے۔ انھیں آنند لہر کے افسانوں کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ جس میں عصری صداقتوں کو تخلیقی فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔''

یہ بھی ایک اہم بات ہے جس کی طرف کمال پاشی صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ کچھ لوگوں کو آنند لہر کی افسانہ نگاری پر اعتراض ہے ان میں بلراج بخشی کے علاوہ چند اور لوگ ہیں جو آنند لہر کو افسانہ نگار نہیں

مانتے۔ان کا کہنا ہے کہ آنندلہر کے افسانوں میں کہانی پن نہیں ہے۔زبان اچھی نہیں ہے،اس کے علاوہ آنندلہر کے افسانوں کے موضوعات گھسے پٹے ہوتے ہیں۔ان کی کہانیوں کا پلاٹ مربوط نہیں ہے۔کرداروں کو بار بار دہراتے ہیں۔ان کا کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں ہے وغیرہ۔یہ لوگ آنندلہر کو افسانہ نگار ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بہت سارے فنکار، نقاد و محقق آنندلہر کی نہ صرف افسانہ نگاری بلکہ ناولوں اور ڈراموں کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔

بلراج بخشی ریاست جموں و کشمیر کے اچھے افسانہ نگار اور مبصر ہیں لیکن آنندلہر کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ کہیں نہ کہیں تعصب کا شکار ہوجاتے ہیں۔لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تنقید میں ذاتی تعصب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی ہے۔

ایک اور اہم بات جس کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ کچھ حضرات نے آنندلہر کے کسی ایک مجموعے کا مطالعہ کیا اور اسی کے تحت ان کی افسانہ نگاری کا معیار جانچنے کی کوشش کی ہے۔چونکہ آنندلہر کے پانچ افسانوی مجموعے ہیں جن میں انھوں نے تجریدی، تمثیلی، استعاراتی، بیانیہ اور روایتی یعنی ہر قسم کے افسانے لکھے ہیں اور ان میں ہر افسانے کی اپنی انفرادیت ہے۔اس طرح یہ لوگ غلطی فہمی کا شکار ہوگئے ہیں۔کچھ لوگ آنند لہر کی افسانہ نگاری پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آنندلہر کے افسانے عام قاری کے لیے نہیں بلکہ باشعور قاری ہی ان کو سمجھ سکتا ہے۔یہ بھی پورا سچ نہیں ہے۔

افسانوی مجموعہ ''انحراف'' میں آنندلہر نے تجریدی، تمثیلی انداز کے افسانے لکھے ہیں لیکن ان کے علاوہ دیگر افسانوی مجموعوں میں روایتی اور عام فہم افسانے لکھے ہیں جنہیں عام قاری بھی پڑھ کر آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔''انحراف'' میں تجریدی اور چھوٹے چھوٹے افسانے ہیں، ان میں کچھ تو افسانچے ہیں لیکن کام کی بات ان میں بہت کم الفاظ میں کہی ہے گو کہ اختصار آنندلہر کے افسانوں کا اہم پہلو ہے۔

نامی انصاری آنندلہر کی افسانہ نگاری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آنندلہر ایک مشاق افسانہ نگار ہیں انھوں نے زندگی کے مختلف
> روشنیوں اور تاریکیوں کو اپنے فن میں نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی

ہیں۔ان کی مجوزہ کتاب ''کورٹ مارشل'' کے افسانوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد کی زندگی کے تانے بانے سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور اپنے مشاہدات و تجربات کو افسانوں کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں۔ان کے موضوعات میں تنوع کی کمی نہیں ہے لیکن ان کی توجہ کا مرکز انسانی صورتحال ہے جس سے زندگی میں تناؤ پیدا ہوتا ہے اور پھر یہ بھری پڑی دنیا اپنی تمام خوبصورتی کے باوجود غلاظت کا ڈھیر نظر آنے لگتی ہے... آنند لہر کی امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا نظریاتی افق بہت وسیع ہے۔وہ انسانیت کی اکائی پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ان کو خانوں اور ملکوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتے۔ان کے افسانوں کی کائنات خیالی نہیں ہے بلکہ زندگی کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔آنند لہر پیشے سے وکیل ہیں اس لیے بھی ان کے افسانوں کے تانے عموماً چست درست ہوتے ہیں اور ان میں شاذ و نادر کوئی بھول ہوتی ہے۔ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ پامال موضوعات کو نہیں چھوتے بلکہ اپنے افسانوں کے لیے نئے موضوعات کی تلاش میں رہتے ہیں۔خاص بات یہ ہے کہ وہ انسانیت کی کامل اکائی پر یقین رکھتے ہیں۔اس کو ملکوں اور خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتے بلکہ زمین کی سرحد بناوٹی ہیں اور انسانیت کو سرحدوں سے نہیں ناپا جاسکتا۔''(8)

انور کمال حسینی آنند لہر کی افسانہ نگاری کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''آنند لہر ایک جدید افسانہ نگار ہیں۔آنند لہر ایک جانے پہچانے قلمکار ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں زندگی کے رنگا رنگ رویوں کی عکاسی کرتے ہیں کیونکہ وہ زندگی کے بہاؤ میں سے ہی اپنے تھیم چنتے ہیں۔اسی لیے ان کے افسانوں کو زندگی کے رواں دواں بہاؤ کی دین کہا جاسکتا ہے۔مجھے کہنے دیجئے کہ ان کے افسانے زندگی کی کاشیں ہوتے

ہیں جو زندگی کی طرح کھٹے میٹھے کڑوے تیکھے کسیلے اور تیز ہوتے ہیں۔ اور ان کے افسانوں کے کردار دوردیس کے اجنبی نہیں ہوتے بلکہ ہمارے معاشرے کے جانے پہچانے افراد ہوتے ہیں۔ آنند لہر کے افسانے مختصر ہوتے ہیں لیکن مختصر ہوتے ہوئے بھی زندگی پر محیط ہوتے ہیں۔ ان پر کسی تحریک یا ازم کا اثر نہیں ہے اسی لیے ان کا ادب برائے زندگی ہے اور ادب برائے زندگی ہونے کی وجہ سے ان کے افسانے زندگی کی افراتفری کی عکاسی کرتے ہیں اور انسانی رشتوں، سماجی رابطوں اور اخلاقی قدروں کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ آنند لہر حالات کا ماتم نہیں کرتے۔ ان کا اسلوب براہ راست سادہ اور دلچسپ ہوتا ہے جو قاری کو اپنے ساتھ لے چلتا ہے۔ آنند لہر کے افسانوں میں دوڑتی ابھرتی، سسکتی جوجھتی زندگی کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کچھ بھی زیب داستان نہیں ہے یہ تو میری تیری اور ہم سب کی کہانی ہے۔'' (9)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد آنند لہر کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے عزیز دوست آنند لہر دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ صف اول کے افسانہ نگار، ناول نگار اور تمثیل نگار ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں لیکن ابھی تک بطور شاعر وہ منظر عام پر نہیں آئے منظر خاص تک ہی محدود ہیں جہاں تک فکشن نگاری کا تعلق ہے ان کے افسانے ملک کے ادبی جریدوں میں شائع ہو کر خواص و عوام سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔'' (10)

ڈاکٹر پریمی رومانی کے مطابق:

''آنند لہر جدیدیت سے متاثر ہیں لیکن وہ روایت کی پاسداری کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے سماج کے بہت ہی حساس اور نازک پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے۔ آنند لہر کے مکالموں میں زبان کی گراں باری محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ انوکھے انداز میں اپنی بات دوسروں تک پہنچا

دیتے ہیں۔''(11)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے فنکار ادیب نقاد و محقق جنھوں نے آنند لہر کے فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان کی تخلیقات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ان میں شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کا ذکر یہاں کر رہا ہوں۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب آنند لہر کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آنند لہر کی افسانہ نگاری پر اب شک کی گنجائش نہیں انھوں نے تین دہائیوں کی مدت افسانہ نگاری کے میدان میں صرف کی ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ وہ فیشن کی ہوا میں بے راہ رو نہیں ہوئے۔ شروع ہی سے انھوں نے جو استعاراتی اور علامتی لیکن سہل اور آسانی سے دل میں بیٹھ جانے والا ادب اختیار کیا تھا اس پر وہ ہمیشہ قائم رہے۔ معاصر دنیا کا عکس ان کے افسانوں میں نہ اس طرح جھلکتا ہے کہ اخباری رپورٹ معلوم ہو اور نہ اس قدر دھندلا یا گنجلک ہے کہ اس کے خدوخال کو پہچاننے کے لیے دیر تک الجھنا پڑے۔ آنند لہر کی نثر پر جدید شعرا کا اثر جابجا نظر آتا ہے۔ لیکن انھوں نے شعر کو بیانیہ پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ان کے دو حالیہ افسانوی مجموعے ''سرحد کے اس پار'' اور ''انحراف'' اس بات کی دلیل ہیں کہ آنند لہر نے دنیا کے بدلتے ہوئے رنگوں کو اپنے بیانیہ تخیل کے آئینے میں بہت خوبی سے اتار لیا ہے۔''(12)

گوپی چند نارنگ آنند لہر کے فن پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آنند لہر پیشے سے وکیل ہیں لیکن زندگی کی روداد کو کہانی بنانے کے ہنر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ گزشتہ چار دہائیوں سے کہانیاں اور ناول لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کے مطالعے سے ان کے مشاہدات کی وسعت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں زندگی کے نشیب و فراز کے اظہار میں توازن ملتا ہے جو ان کے تخلیقی رویے کو مستحکم کرتا ہے۔ وہ جب اپنے اردگرد کے تضاد و تصادم کو دیکھتے ہیں تو تڑپ اٹھتے ہیں۔ ہندستان اور پاکستان کے درمیان رشتوں کی

کشاکش ہو یا دہشت گردانہ سرگرمیاں یا پھر سماجی ناانصافی یا ظلم و جبران کے خلاف وہ اپنی آواز اپنے انداز سے اٹھاتے ہیں۔ اب تک ان کے پانچ ناول، چار افسانوی مجموعے اور تین ڈراموں کے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ''سریشٹھ نے بھی یہی لکھا ہے'' ان کا پانچواں افسانوی مجموعہ ہے جس میں ہر افسانہ اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ ان کے فکشن میں خودغرضی اور انسانی استحصال کی بات ہو یا محبت کے درمیان خلیج کا معاملہ، انسانی امیدوں اور آرزوؤں کی بات ہو یا اخلاقی اور تہذیبی قدروں کا زوال ہر تصویر ہمیں غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔''(13)

ان تمام فنکاروں کی آرا کو مدنظر رکھتے ہوئے مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنند لہر دور حاضر کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ اس کا ثبوت ہمارے سامنے ان کے پانچ افسانوی مجموعے ہیں جن کا اعتراف دورِ حاضر کے فنکاروں اور نقادوں نے کیا ہے۔ لیکن چند حضرات کو آنند لہر کی افسانہ نگاری پر اعتراض ہے۔ میرا ماننا ہے کہ ان کو آنند لہر کے فکشن کا مطالعہ ذاتی تعصّبات کو بالائے طاق رکھ کر کرنا چاہیے۔

آنند لہر کے افسانوں میں کہانی پن، اختصار اور آسان زبان کے علاوہ دیگر افسانوی جذبات بھی موجود ہیں، جس کی بنا پر نہ صرف ریاستی بلکہ ملک کے فنکاروں اور نقادوں نے ان کے فن کو سراہا ہے۔ ہاں کچھ خامیاں ضرور ہو سکتی ہیں جیسے ان کے افسانوں میں کہیں کہیں لفظی غلطیاں ہیں اس کے علاوہ انھوں نے تین افسانوی مجموعوں میں کچھ کہانیوں کو دوہرایا ہے۔ لیکن اس بنا پر ہم ان کی افسانوی تخلیقات کو نکار نہیں سکتے، اور یہ بھی سچ ہے کہ ہر کوئی منٹو، کرشن چندر اور بیدی نہیں بن سکتا۔

ادب کی کسی بھی صنف میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وقت اسے ادب کے ترازو میں ضرور تولتا ہے کہ تخلیق کئے جانے والے فن پارے کی ادبی حیثیت کیا ہے؟ اس کا کتنا حصہ قابل قدر ہے؟ اس میں کوئی نئے رجحانات و امکانات وزاویے نظر آتے ہیں یا نہیں؟

ادب کی جتنی بھی اصناف ہیں ان کے اپنے اپنے اصول وضوابط، فنی لوازمات اور پابندیاں ہوتی ہیں۔ شاعری کی طرح افسانے کے بھی جمالیاتی اصول اپنی ایک ترتیب اور فنی وتکنیکی تقاضے ہیں۔ جن کے بغیر

ایک اچھے افسانے کی تخلیق ممکن نہیں۔

اگر چہ بعد میں کچھ ایسے بھی افسانے لکھے گئے جن میں افسانوں کے جذبات / اجزائے ترکیبی کو نظر انداز کیا یعنی عمل میں نہیں لایا گیا لیکن پھر بھی ایک افسانہ نگار کی تخلیق کو ان جذبات کی بنا پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اختصار

افسانے کی سب سے بڑی خصوصیت اور خوبصورتی اس کا اختصار، یعنی مختصر ہونا ہے۔ مختصر افسانہ ادب کی وہ صنف ہے جس کی اپنی ایک فنی ترتیب، جمالیاتی اصول، معیار اور قدریں ہوتی ہیں اور افسانہ اپنی ان ہی اصولی قدروں سے پہچانا جاتا ہے۔ غیر ضروری لفاظی اور کاریگری دکھانے کے شوق میں افسانے غیر ضروری طوالت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر چہ کہانی سننا اور سنانا قدیم دور سے انسانی فطرت ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ انسان نے ترقی کی اور وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس کے پاس داستانیں سننے اور سنانے کا وقت نہیں رہا اور پھر ناول اور افسانے کا دور آیا۔ ناول کسی پوری زندگی محیط ہوتی ہے لیکن افسانے میں زندگی کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس لیے افسانے میں اختصار بہت ضروری ہے۔ اور جہاں تک آنند لہر کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے ''اختصار'' آنند لہر کے افسانوں میں شروع سے آخر تک دیکھنے کو ملتا ہے۔ آنند لہر نے پہلے افسانوی مجموعے ''انحراف'' میں تجریدی افسانے لکھے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے افسانے ہیں اور کچھ تو اتنے مختصر کہ افسانچے لگتے ہیں، لیکن کام کی بات آنند لہر نے ان میں کم الفاظ میں کہی ہے۔ ''انحراف'' کے علاوہ دیگر افسانوی مجموعوں میں بھی اختصار پایا جاتا ہے۔ ان کے تجریدی افسانوں کے علاوہ دیگر افسانے بھی زیادہ طویل نہیں ہیں، جن میں آنند لہر نے سماجی، سیاسی اور انسانی زندگی کے حقائق کو فنکارانہ انداز میں بخوبی پیش کیا ہے۔

مختصر یہ کہ آنند لہر چار دہائیوں سے افسانہ نگاری کے میدان میں افسانے لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے کئی قسم کے افسانے لکھے، تجریدی، تمثیلی، استعاراتی، بیانیہ، روایتی وغیرہ لیکن ہر دور میں اختصار ان کے افسانوں میں آب و تاب کے ساتھ رہا۔

پلاٹ

پلاٹ افسانوی ادب کا اہم اور بنیادی جز ہوتا ہے بغیر پلاٹ کے کسی بھی کہانی کا ہونا ممکن نہیں۔ واقعات کے منطقی ربط کو پلاٹ کہا جاتا ہے۔ پلاٹ کہانی کی ترتیب کو کہتے ہیں۔

آنند لہر کے افسانوں کا پلاٹ عموماً چست درست اور مربوط ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں آغاز نقطۂ عروج اور انجام ہوتا ہے اور ہر موضوع کو منطقی انجام تک پہنچاتیہیں۔ ان کے افسانوں میں پیچیدگی نہیں ہوتی بلکہ سادہ بیانی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

انور کمال حسینی لکھتے ہیں:

''آنند لہر کے افسانوں میں دوڑتی ابھرتی، سسکتی جھومتی زندگی کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کچھ بھی زیب داستاں نہیں یہ تو میری تیری اور ہم سب کی کہانی ہے کیونکہ وہ جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں ان کو بغیر لاگ لپیٹ کے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مسائل زندگی اور اس کے رابطوں کا حصہ ہوتے ہیں۔''(14)

آنند لہر کا ہر افسانہ اپنی الگ نوعیت رکھتا ہے، ان کے افسانوں میں موضوع کا تنوع ہے لیکن ان کا پلاٹ دلچسپ اور مربوط ہوتا ہے۔ نقطۂ عروج میں کافی ہلچل ہوتی ہے اور انجام پر تاثر ہوتا ہے۔ ان کی ایک کہانی ''انصاف'' جو عورت کے موضوع پر مبنی ہے۔

ایک لڑکی اپنے گھر میں اکیلی ہوتی ہے، کچھ لوگ وہاں آکر اس کو اپنی ہوس کا شکار بناتے ہیں۔ یہ حادثہ کچھ لوگ دیکھتے ہیں اور وہاں پولیس آجاتی ہے اور مقدمہ درج کر کے چھان بین شروع کرتی ہے۔ اس حادثے میں کافی وقت گزر جاتا ہے اور بعد میں اس کی شادی ہوجاتی ہے۔ وہ سسرال میں جا کر اپنی نئی زندگی شروع کرتی ہے، اس کا شوہر ساس اور سسر بہت خوش رہتے ہیں، کچھ وقت بعد اس کو بچے بھی ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی خوشحالی میں گزرتی ہے۔ بعد میں ایک دن کئی میڈیا والے ان کے گھر آکر اس کے شوہر کو بتاتے ہیں کہ ان کے گناہ گاروں کو سزا مل گئی ہے اور تفصیلاً وہ اسے سب کچھ بتاتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا شوہر، ساس اور سسر اس کو غلط سمجھتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں۔ ہر طرح کی باتیں کرتے ہیں اور کہانی کا اختتام ہوجاتا ہے۔

آنند لہر نے اس کہانی میں عورت کے ساتھ ہونے والے ظلم اور اس کی لاچاری کو بخوبی بیان کیا ہے۔ پہلے تو اس کے ساتھ ظلم و جبر ہوا اور بعد میں بھی ذلیل کیا گیا، یہاں تک کہ گھر کے لوگوں نے بھی مختصر سی کہانی ہے لیکن ایک قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ واقعی یہ یہ ہمارے سماج کی حقیقت ہے۔ اس میں کہانی کا آغاز عام

طور سے ہوتا ہے کہ لڑکی اپنے گھر میں اکیلی بیٹھی تھی...اس کے ساتھ لوگ جبر وظلم کرتے ہیں... پولیس مقدمہ درج کر کے تفتیش کرتی ہے...کچھ عرصہ بعد اس کی شادی ہوجاتی ہے...سسرال میں جا کر خوش رہتی ہے اور پھر بچے بھی ہوتے ہیں...نقطۂ عروج اور انجام...میڈیا والے لڑکی کے ماضی کے حادثے کی تفصیل بتاتے ہیں۔ اس کا شوہر، ساس اور سسر بھی اس کو برا بھلا کہتے ہیں۔ ہمارے سماج میں موجودہ صورتحال دیکھیں تو ایسے بہت سارے واقعات روز بروز ہماری نگاہوں کے سامنے گزرتے رہتے ہیں۔

کردار نگاری

کرداری نگاری افسانے کا اہم جز ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کرداروں کے ذریعے ہی کہانی کو آگے بڑھاتا ہے اور مکالموں کے ذریعے کہانی کا اختتام کرتا ہے۔ آنند ہر نے مختلف موضوعات پر افسانے لکھے ہیں اس لیے ان کے یہاں مختلف قسم کے کردار ہیں۔ لہر نے سماج میں ہونے والے حادثات، مسائل اور سماجی سیاسی حالات کو افسانوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کے یہاں مختلف کردار ہیں، بچے، بوڑھے، نوجوان، عورت، مرد، ضعیف، امیر، غریب وغیرہ کو اپنے افسانوں کا کردار بنایا ہے۔ راجہ، رانی، روشن، گوری جیسے کردار بھی آنند لہر کے یہاں پائے جاتے ہیں یعنی کہ جو نام ہمارے سماج میں عام ہے، اس نام کے کرداروں کو آنند لہر نے افسانوں میں جگہ دی ہے گو کہ وہ ان سے متاثر نظر آتے ہیں۔

''سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے'' ایک دلچسپ افسانوی مجموعہ ہے جس کا ہر افسانہ اپنی الگ نوعیت رکھتا ہے، جس میں مختلف قسم کے انسانی کرداروں کے علاوہ جانوروں کو بحیثیت کردار کے پیش کیا گیا ہے۔ ایک افسانہ ''الگ صوبہ'' جس میں انسانی کردار نہیں ہیں بلکہ حیوانوں کو اس افسانے کا کردار بنایا ہے اور موجودہ حالات میں انسانی قدروں کے زوال پر طنز کیا ہے۔ انسان جسے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے آج کے دور میں انسانی قدروں کو بھول گیا ہے اور اس قدر وحشی ہو گیا ہے کہ جانور بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اس کہانی کا آغاز آنند لہر نے دلچسپ انداز میں کیا: بلاتکار کے واقعے اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ جانوروں کو اپنی جانوریت خطرے میں لگنے لگی۔ لہٰذا جانوریت کو بچانے کے لیے جانوروں نے ایک بہت بڑے اجلاس کا اہتمام کرنے کا فیصلہ کیا اور ساتھ میں تمام جانوروں سے کہا گیا کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو نہ بتائیں کیونکہ

انسانیت کو بچانے کے لیے جو کانفرنس منعقد کرنے کا جو منصوبہ تیار کیا گیا تھا وہ اندرونی تضاد کی نذر ہو گیا اور اس کی وجہ سے ایک اور فساد ہوا جس میں پہلے فساد کی طرح ہی سہاگنوں کے سہاگ اجڑ گئے اور بچے یتیم ہو گئے۔

آنند لہر نے یہ افسانہ موجودہ انسانی اقدار کی گرتی ہوئی تصویر کو جانور کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے اور جس میں ہر جانور اپنی اپنی صفات بتا کر انسانی خصائل سے خوف کھاتا ہے۔ اس میں ہاتھی، چوہا، لومڑی، بلی کے علاوہ سانپ، کتا، شیر، ہرن وغیرہ جانوروں کو کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

لومڑی نے کہا: انسان مجھ سے مکاری میں اوپر ہو گیا ہے۔ کاغذوں پر درخت اگانے کے فیصلے کرتا ہے، مگر حقیقت میں درخت اجاڑنے کے منصوبے بناتا ہے۔ امن کی بات کرتا ہے مگر اندر ہی اندر جنگ کی تیاری کرتا ہے۔ زمین سے دھاتیں نکال کر اسے زخمی کر چکا ہے۔

سانپ نے اپنی بات رکھتے ہوئے کہا: میرے تمام ڈنگ بے کار ہو گئے ہیں اور میں اگر اب کسی کو ڈنک مارتا ہوں تو اثر نہیں ہوتا کیونکہ انسان بات کرتا ہے تو لگتا ہے کہ ڈنگ مار رہا ہے۔

چوہا جانوروں کو خطاب کرتے ہوئے کہنے لگا: انسان کی وجہ سے ہماری نسل ختم ہو جائے گی۔ وہ اس طریقے سے کہ ہم انسانوں کے گھر سے اناج کھاتے، سبزیاں کھاتے ہیں مگر وہاں ہر چیز میں ملاوٹ ہے۔ ہمارے بچے بھی کمزور پیدا ہو رہے ہیں اور ہمیں بھی کئی بیماریاں لگ رہی ہیں۔

چیتے نے کہا: انسان کو معلوم نہیں ہے یہ ملاوٹ اس کے لیے بھی موت ہے۔

ہرن نے کہا: وہ سوچتا نہیں ہے بلکہ کرتا ہے۔ اس کی لالچ اور ہوس اتنی آگے بڑھ گئے ہیں کہ اس میں سوچنے کی طاقت ہی نہ رہی ورنہ وہ کیا یہ سوچ نہیں سکتا کہ ایٹمی ہتھیار پوری دنیا کو تباہ کر دیں گے مگر اس کے باوجود ہتھیار بناتا ہے۔

اس کے بعد کتے نے اپنی بات رکھی: میں سونگھنے کی طاقت رکھتا ہوں اس لیے ہر چیز کی خوبی کے متعلق اچھی طرح کہہ سکتا ہوں۔ اس لیے اپنے تجربات اور حالات کے مطابق میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب کتوں کی نسل انسان کے ساتھ رہنے کے قابل نہ رہی کیونکہ انسان تو انسانیت سے گر گیا مگر کتا کسی بھی طرح سے اپنی کتیت یعنی وفاداری نہیں چھوڑ سکتا ہے۔ انسان اب معصوم لڑکیوں کو اپنی ہوس کا شکار بنا رہا ہے مگر کتوں میں

ایسا نہ ہے کیونکہ چھوٹی چھوٹی معصوم کتیوں کے ساتھ کوئی بڑا کتا غلط کرنے کے بارے میں سوچ نہیں سکتا ہے اور انسان نے جو سیاسی نظام بنایا ہے اس میں مجھے لگتا ہے کہ کتوں کی وفاداری بھی کمزور ہو جائے گی۔

سب جانور کتنے کی یہ بات سن کر اور یہ جان کر کہ انسان چھوٹی بچیوں کو اپنی ہوس کا شکار بناتا ہے۔ اک دم نعرے لگانے لگے۔ ''انسانیت مردہ باد''، ''حیوانیت زندہ باد''۔

آخر میں تمام جانوروں نے اپنے لیے الگ صوبے کی مانگ کی۔ یہ افسانہ نہایت ہی دلچسپ ہے۔ اس میں آنند لہر نے حیوانی کرداروں کے ذریعے موجودہ انسانی اقدار پر طنز کیا ہے۔ اس کے علاوہ آنند لہر نے مختلف قسم کے افسانے تحریر کیے ہیں اور جن میں تقریباً ہر طرح کے کرداروں کے ذریعے افسانوں میں عصری سماجی حقائق کو بیان کیا ہے۔

موضوع

افسانہ نگار جب کہانی لکھتا ہے تو کوئی نہ کوئی موضوع اس کے مدنظر رہتا ہے بغیر موضوع کے کوئی بھی کہانی ممکن نہیں ہوتی۔ ہر دور میں افسانہ نگاروں کے یہاں مختلف موضوعات رہے ہیں۔ ہر دور کا اپنا تقاضا ہوتا ہے اور فنکار اس وقت کے حالات کو مدنظر رکھ کر اپنے افسانوں کے موضوعات کا انتخاب کرتا ہے۔ رومانوی تحریک کے اپنے تقاضے تھے اور ترقی پسند تحریک وغیرہ کے اپنے۔ لہٰذا اگر ہم اس دور کے افسانوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے دوران افسانہ نگاروں نے رومانی افسانوں کے بجائے کسانوں، مزدوروں یعنی عام لوگوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ وقت گزرنے کے بعد جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے اپنے تقاضے رہے اور افسانہ نگاروں کے یہاں موضوعات میں تبدیلی آئی۔ جدیدیت کے تحت افسانے لکھے جانے لگے اور تقریباً ہر قسم کے موضوعات پر افسانہ نگاروں نے قلم اٹھایا۔

جہاں تک آنند لہر کی افسانہ نگاری میں موضوعات کا تعلق ہے (آنند لہر) انھوں نے متعدد افسانے لکھے اور جن میں مختلف موضوعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ لیکن انسان انسانیت اور انسانی زندگی ان کے مرکزی موضوعات رہے۔ آنند لہر نے موجودہ حالات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور انھیں فنکارانہ بصیرت سے بخوبی پیش کیا۔ انھوں نے انفرادی، سماجی، سیاسی، معاشی وغیرہ دیگر مسائل کو اپنے افسانوں کا

موضوع بنایا۔

ہمارے سماج میں قدیم دور سے ہی کئی مسائل رہے ہیں جن میں انسان کو دوچار ہونا پڑا اور بعد میں یعنی کہ آج تک اگرچہ انسان نے بہت ترقی کی لیکن پھر بھی ہمارے سماج میں خاص طور سے عام انسان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد بھی ہمارے یہاں کئی مسائل ہیں سماجی و معاشی نابرابری۔ امیر امیر ہوتا جارہا ہے اور غریب اور غریب ہوتا جارہا ہے۔ اور امیر ہمیشہ غریب پر ظلم اور اس کا استحصال کرتا ہے۔

اس کے علاوہ عورت پر برسوں سے ظلم ہوتا آرہا ہے اور اگرچہ سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اس کو روکنے کے لیے کام کررہے ہیں لیکن اس میں کمی نہیں۔ آنند لہر کے یہاں عورت کا بھی اہم موضوع رہا ہے۔ آنند لہر نے عورت کے مسائل کو نہایت ہی باریک بینی سے دیکھا ہے اور اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ اس کا ثبوت ان کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ عورت جس کے ساتھ ہر دور میں ظلم ہوتا آرہا ہے اور آج بھی اس میں اضافہ ہورہا ہے۔ اس کے علاوہ سماج میں ہونے والے واقعات کو بھی آنند لہر نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

رشوت خوری آج کے دور کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کوئی بھی کام رشوت کے بغیر پورا نہیں ہوتا جس سے ہمارا سماج کھوکھلا ہورہا ہے۔ آنند لہر نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ان کا ایک افسانہ ''اب تھانہ چل پڑے گا'' اسی موضوع پر مبنی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے عشقیہ مسائل کو بھی آنند لہر نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

آنند لہر ملک کی تقسیم بہت متاثر ہوئے تھے حالانکہ ملک کا بٹوارہ ان کی پیدائش سے کچھ سال قبل ہوا تھا لیکن آنند لہر چونکہ سرحدی علاقے میں رہتے تھے اس لیے ان کے یہاں ہجرت، سرحد اور بٹوارے سے پیدا شدہ مسائل جن سے وہ متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں ہجرت اور سرحد کے حوالے سے کئی افسانے دیکھنے کو ملتے ہیں اور ان کے نتائج اور عوام کی مشکلات کو آنند لہر نے بخوبی پیش کیا ہے۔

سرحد جو کہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اور سرحد پر رہنے والے لوگوں کو ہر روز وہاں کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ آنند لہر نے ان مسائل کو نزدیک سے دیکھا اور فنکارانہ صلاحیت سے افسانوں میں پیش کیا۔

عورت جسے ہر دور میں ہر مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔اس کا استحصال ہوتا ہے۔مرد عورت کو اپنی ضروریات پوری کرنے کی چیز سمجھتا ہے۔اس کے علاوہ ایسے ایسے کام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ عورت کو اپنی شناخت چھپانی پڑتی ہے۔عورت جس سے مرد کا وجود ہوتا ہے،اسے ویشیا بننے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

آنند لہر کے مطابق سبھی مذہبوں کی تعلیم یہی ہے کہ عورت عظیم ہے۔اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔جب تک یہ سرحدیں قائم رہیں گی،انسانی رشتوں کی موت ہوتی رہے گی اور دنیا کی کوئی چیز محفوظ نہیں رہے گی یہاں تک کہ انسانی جسم بھی۔اس لیے جنگ انسانوں کے خلاف نہیں بلکہ عورت کی عزت بچانے کے لیے ہونی چاہیے۔اس کے علاوہ آنند لہر نے مختلف مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

نقطۂ عروج

نقطۂ عروج کو افسانے کا اہم جز مانا جاتا ہے۔جہاں تک آنند لہر کے افسانوں میں نقطۂ عروج کا تعلق ہے یہ خوبی بھی آنند لہر کے افسانوں میں پائی جاتی ہے۔ان کی ایک کہانی ''کورٹ مارشل'' ہے جس میں آنند لہر نے ایک سپاہی کی کہانی بیان کی ہے جو سرحد پر پہرہ دیتا ہے۔ایک دن سیلاب آیا اور سرحد کا پتہ نہیں چلا وہاں کے لوگ تتر بتر ہو گئے اور حالت یہ ہوگئی کہ لوگ بھی دوسرے کو پہچاننے سے قاصر ہو گئے۔وہاں فوجی بھی عام لوگوں کی مدد کر رہے تھے لیکن بعد میں ان کے درمیان لڑائی شروع ہوئی۔ایک فوجی افسر جس نے پہلے اپنے ملک کے لیے کئی جنگیں لڑی تھیں لیکن اس بار وہ اپنی ہی فوج کے خلاف جنگ لڑ رہا تھا اور بعد میں اس کو غدار قرار دیا اور فوجی عدالت میں اس پر مقدمہ ہوا اور اس سے اس بارے میں پوچھا گیا تو اس فوجی نے جواب دیا؛

> ''ہر طرف ایک ہی طرح کے درخت تھے اور پانی کا رنگ بھی دونوں ملکوں کا ایک جیسا تھا،چڑیوں کے چہچہانے کا طریقہ بھی ایک جیسا تھا۔ جب سیلاب آیا تو دونوں ملکوں کے لوگ ایک ہی طرح سے چیخے،ان کے گھر بھی ایک ہی طریقے سے بہے تھے،یہ معلوم نہ ہو سکا کہ دھرتی کا کون سا حصہ کس ملک کا ہے۔''
>
> ''اور مجھے معلوم ہو گیا ہے ہم تو لڑنے کے لیے لڑتے ہیں کیونکہ زمین تو بس زمین ہے نہ اس کا کوئی ملک ہے اور نہ ہی کوئی مذہب''۔(15)

ذاتی تجربہ ومشاہدہ

افسانے میں افسانہ نگار کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ضرور ہونا چاہیے۔ کیونکہ افسانے کی پختگی کا دارومدار افسانہ نگار کے ذاتی مشاہدات اور تجربات پر ہوتا ہے۔ اس لیے قاری کو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ افسانہ نگار اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر نہیں ہے اور یہی وصف کسی بھی افسانہ نگار کو ممتاز بناتی ہے۔ جہاں تک آنند لہر کے افسانوں میں مشاہدے اور تجربے کی بات ہے تو آنند لہر بنیادی طور پر وکیل ہیں۔ ان کو ہر روز کئی معاملات پر وکالت کرنی پڑتی ہے اور یہ معاملات کوئی آسمانی نہیں ہوتے بلکہ ہمارے سماج کے مسائل ہیں جو آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ اس میدان میں آنند لہر ایک عرصے سے کام کر رہے ہیں اور وہاں تقریباً سماج کے مختلف لوگوں سے ان کا واسطہ پڑتا ہے اور ان کی ذہنی فکر اور نفسیات کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے، جن کا اثر ان کے افسانوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ ایک سماجی کارکن بھی ہیں۔ مختلف سماجی فلاح و بہبود کا کام انجام دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں تجربات ومشاہدات کی رنگارنگی سے ان سے سمجھا جاسکتا ہے۔

اسلوب وزبان وبیان

آنند لہر نے اپنے افسانوں میں عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ کچھ حضرات کا ماننا ہے کہ آنند لہر کے افسانوں میں زبان اچھی نہیں ہے، معیاری زبان نہیں ہے۔ آنند لہر نے عصر حاضر سماج کے حالات کو افسانوں میں پیش کیا ہے اور جیسا کردار ہوتا ہے ویسی ہی زبان بھی استعمال کی ہے۔ وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں انگریزی، ہندی، ڈوگری کے الفاظ اور جملے کثرت سے مل جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آنند لہر افسانے کے تمام رموز واسرار سے بخوبی واقف ہیں اور ان کے افسانے انسانی زندگی کے تمام مسائل ومشکلات سے سروکار رکھتے ہیں۔

☆☆☆

حواشی:

(1) نصرت چودھری، (ششماہی ماہنامہ) شیرازہ، جموں وکشمیر: اکیڈمی آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، شمارہ5 تا7، جلد34، ص:

(2) اسیر کشتواڑی، آب جو، کشمیر: اردو نیشنل ڈیولپمنٹ سوسائٹی، ص:90

(3) آنند لہر، سرحد کے اس پار، نئی دہلی: سیمانت پرکاشن، 2001، ص:9

(4) آنند لہر، بٹوارہ، دہلی: اردو بک سوسائٹی، 2009، دیباچہ

(5) ایضاً، ص:29

(6) تسلسل (ماہنامہ)، جلد8 ، شمارہ15، جموں یونیورسٹی: شعبۂ اردو، 2005، ص:29

(7) شاعر (ماہنامہ)، جلد76، ممبئی: 2005، ص:9

(8) آنند لہر، کورٹ مارشل، جموں: مانوی پرکاشن، 2005، ص:11-6

(9) آنند لہر، انحراف، دہلی: ملک بک ڈپو، 2002، ص:4-3

(10) فدا کشتواڑی، (مرتبہ) آنند لہر شخصیت اور فن، جموں وکشمیر: اردو نیشنل ڈیولپمنٹ سوسائٹی،

(11) ایضاً۔

(12) ایضاً۔

(13) آنند لہر، سریشٹا بھی یہی لکھا ہے، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2015، کور صفحہ

(14) آنند لہر، انحراف، دہلی: ملک بک ڈپو، 2002، ص:4

(15) آنند لہر، کورٹ مارشل، جموں: مانوی پرکاشن، 2006، ص:30

باب سوم

ہجرت، سرحد اور عورت: آنند لہر کے فکشن کا مطالعہ

(الف) آنند لہر کے فکشن میں ہجرت

(ب) آنند لہر کے فکشن میں سرحد

(ج) آنند لہر کے فکشن میں عورت

(الف)

آنند لہر کے فکشن میں ہجرت

ہجرت عربی زبان کا لفظ ''ہجر'' سے مشتق ہے جس کے معنی 'جدائی' اور مفارقت کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں ہجرت سے مراد اپنی ہجرت، علاقے، گاؤں، شہر اور ملک سے جدائی کے ہیں۔ لیکن تاریخی اعتبار سے مسلمانوں کے پیغمبر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے احباب و پیروکاروں کے ساتھ مکہ سے مدینہ جانے کے عمل کو 'ہجرت' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ہجرت ایک ایسا عمل ہے جس میں افراد، خاندان یا انسانی گروہ اپنے آبائی ملک، اصل وطن، آبائی علاقے اور پشتینی زمینوں کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک یا علاقے میں ہمیشہ کے لیے یا وقتی طور پر جا بسیں۔ ہجرت کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانی زندگی۔ انسانی ارتقا کی سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کے آبا و اجداد جراثیم تھے جو پانی میں رہا کرتے تھے۔ ان کی کلب ماہیت ہوئی تو وہ کائی میں تبدیل ہوئے اور ارتقا کے بے شمار مدارج و مراحل سے گزرتے ہوئے انھیں کائیوں سے حیات انسانی نمو پذیر ہوئی اور جس نے تری کو چھوڑ کر خشکی کو اپنا مسکن بنالیا۔ اگر اس نظریے کو درست مان لیا جائے تو انسانی وجود اس ابتدائی ذی روح کے پانی سے خشکی کی جانب ہجرت کا نتیجہ ہے۔ گویا پہلی ہجرت پانی سے خشکی کی جانب ہے۔

سائنس کے علاوہ دنیا کے مختلف مذاہب کا ہجرت کے تعلق سے اپنا تصور ہے۔ ہندو مذہب میں یہ تصور مختلف ہے۔ 'برہما' جو تمام کائنات کا خالق ہے۔ اس نے خود کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ 'نر' اور دوسرا 'مادہ'۔ نر سے 'منوسویمبھو' پرکٹ (ظاہر) ہوئے اور 'مادہ' سے 'ست روپا'۔ یہ دونوں پہلے انسان تھے جن کے ملن سے ساری انسانی آبادی وجود میں آئی۔ ان دونوں بھی برہم لوک (عرش) چھوڑ کر پرتھوی لوک (زمین)

پر آنا پڑا۔ لہٰذا ان دونوں کی ہجرت پہلی انسانی ہجرت تھی۔

اسلام کے مطابق اولین مرد حضرت آدم اور اولین عورت اماں حوا کا تصور موجود ہے اور جن کی اولاد ہم سبھی انسان ہیں۔ خطائے گندم خوری کی پاداش میں آدم اور حوا کو جنت سے نکال کر زمین پر پھینک دیا جہاں ایک زمانے تک الگ الگ بھٹکتے رہے۔ بعد میں ان دونوں نے ایک دوسرے کو ڈھونڈ نکالا اور ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ گویا آدم اور حوا پہلے مہاجر تھے جنھوں نے جنت سے زمین کی جانب ہجرت کی۔ اسلام، عیسائی اور یہودی وغیرہ جیسے مذاہب میں آدم اور حوا کا تصور موجود ہے۔ اس طرح ماضی کے ہر دور میں ہر سماج میں اور ہر مذہب کے ماننے والوں کے یہاں ہجرت کا پہلو دیکھنے کو ملتا ہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

نہ صرف انسان بلکہ حیوان اور پرندے بھی اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وقتی یا مستقل طور پر ہجرت کرتے ہیں۔ ہجرت کے عمل کے پیچھے مندرجہ ذیل وجوہات ہوسکتی ہیں:

1- جان، مال، عزت و آبرو کو خطرے میں جان کر
2- جنگ یا خانہ جنگی سے پیدا شدہ حالات سے گھبرا کر
3- ریاستی استبداد سے بچنے کے لیے
4- تلاش و معاش کے لیے
5- مذہب کی اشاعت کے لیے
6- پہلے سے ہجرت کر چکے اہل خاندان کے لیے
7- رشتۂ ازدواج میں بندھ جانے کی وجہ سے
8- ملک کی تقسیم کی وجہ

اس کے علاوہ اور بھی وجوہات ہوسکتی ہیں جن کی وجہ سے لوگ ہجرت کرتے ہیں۔

ہجرت ایک پیچیدہ عمل ہے۔ اس کے اسباب متعدد ہیں۔ اسے کسی ایک خانے میں فٹ کرنا مشکل ہے۔ ہجرت کے ظاہری محرکات جتنے اہم ہیں اتنے ہی باطنی محرکات ہیں۔ ہجرت ایک نفسیاتی عمل بھی ہے۔ ہجرت کا عمل شاید اتنا ہی پرانا ہے جتنی کہ انسانی زندگی، لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ ایک مہاجر کے بعض تجربات

دوسرے مہاجر سے کبھی میل نہیں کھاتے۔ خواہ ہجرت کرنے والے دونوں افراد بھائی ہی کیوں نہ ہوں، لیکن بعض تجربات ایسے ہوتے ہیں کہ زمانی و مکانی فاصلوں کے باوجود ہر مہاجر یکساں ہیں۔ ایسی صورتحال میں ہجرت کی درجہ بندی یا اس کے مختلف اقسام کا جائزہ آسان کام نہیں ہے، لیکن سہولیات کی ہم ہجرت کو مندرجہ ذیل خانوں میں بانٹ سکتے ہیں:

1- علاقے کی بنیاد پر ہجرت کی درجہ بندی

2- ہجرت کی بنیاد پر ہجرت کی درجہ بندی

3- تہذیب کی بنیاد پر ہجرت

4- ارادے کی بنیاد پر ہجرت

ہجرت کرنے والے وہ افراد جنھوں نے اپنے ملک کی شہریت ترک کے دوسرے ملک کی شہریت اختیار کر لی ہو 'مہاجر' کہلاتے ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک کے لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کر کے وہاں آباد ہو جاتے ہیں۔ جن ملکوں میں ہندستانی لوگ جا کر بس گئے ہیں وہ ہیں: ماریشس، انڈونیشیا، ملیشیا، برما، سری لنکا، بنگلہ دیش، پاکستان، انگلینڈ، ناروے، امریکہ، کنیڈا، ویسٹ انڈیز، میکسیکو وغیرہ۔ ہندستان سے پاکستان جانے والے تو ابھی تک پاکستان میں مہاجر کہلاتے ہیں اور ''مہاجر قومی موومینٹ'' (Muhajir Qaumi Movement) نامی ایک سیاسی جماعت پاکستان میں بہت سرگرم ہے۔

رفیوجی جدید عہد کی پیداوار ہے۔ جنگوں اور خانہ جنگیوں یا ریاستی استبداد کی وجہ سے بے شمار افراد اپنے ملک سے بھاگ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لیتے ہیں لیکن انھیں نئے ملک کی شہریت نہیں ملتی بلکہ رفیوجی کہا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ ہائے کمیشن برائے رفیوجی کے 1951 کنونشن کے مطابق:

> A refugee is a person who "owing to a well founded fear of being persecuted for reason of race, religion, nationality, membership of a particular socail group or political opinion is outside the country of his nationality and is unable or, owing to such fear, is unwilling to avail himself of the projection of that country."(1)

تقسیم ہند کا واقعہ برصغیر ہندو پاک کی تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ تقسیم ہند اس کے جلو میں رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور نقل مکانی نے برصغیر کے لاکھوں لوگوں کو متاثر کیا۔ تقسیم ہند کے سبب لاکھوں افراد افراد اپنے صدیوں پرانے گھر بار ملک وشہر کو چھوڑ کر اجنبی دیاروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ مذہب کے نام پر لاکھوں لوگوں کو موت گھاٹ اتارا گیا۔ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ معصوم بچے زندہ جلائے گئے۔ سہاگنوں کی مانگیں اجڑ گئیں۔ ماؤں کی گودیں سونی ہوئیں اور صدیوں کے بنے بنائے آشیانے پل بھر میں شعلوں کی نذر ہوگئے۔ اس انسانی المیے نے شاعر وادیب کو بہت زیادہ متاثر کیا اور ان میں سے زیادہ تر افراد تقسیم ہند کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پائے۔ مذہبی جنون اور نفرت کے مظاہروں کی ان لوگوں نے اپنی تخلیقات میں بھرپور مذمت کی لیکن عام طور سے اس دور کی ادبی تخلیقات میں جذباتیت کا رنگ زیادہ گہرا تھا اور سطحی معاملات پر زیادہ توجہ مرکوز کی گئی تھی۔ تقسیم ہند کے سبب انسانوں کی ایک بڑی تعداد مہاجر بن گئی۔ ابتدا میں مہاجروں کے مسائل کو فرقہ وارانہ فسادات سے پیدا شدہ صورتحال کا ہی عکس سمجھا گیا، لیکن رفتہ رفتہ یہ بات واضح ہوتی گئی کہ ہجرت کے اپنے علیحدہ مسائل ہیں۔ حالاں کہ بعض اوقات ان مسائل کی سرحدیں فرقہ وارانہ فسادات، جنگوں اور خانہ جنگیوں کے نتیجے میں رونما ہونے والے مسائل سے بھی جا ملتی ہیں۔

> ''ہجرت ایک طویل عرصے سے جاری ہے۔ تاریخ، مذہبی حوالوں اور قصص میں بہت سی ہجرتوں کا ذکر موجود ہے۔ ہجرت کا یہ سلسلہ تب بھی تھا آج بھی ہے اور کل بھی جاری رہے گا۔ ممکن ہے کہ اس کی رفتار مدھم ہوگئی ہو اور کبھی تیز، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہجرت کا سلسلہ رک گیا ہو۔ ایک ایسا ہمہ وقت عمل جو علاقائی وجغرافیائی حد بندیوں، مذہبی ولسانی قیود، سماجی وخاندانی رشتوں سے اوپر اٹھ کر اختیار کیا جاتا ہے یقیناً اس کے اسباب ومحرکات یکساں سہل اور سطحی ہو ہی نہیں سکتے۔ سیاست، معاشیت، سماجی تحفظ وغیرہ جیسے عوامل کو یکجا ہو کر وجوہات کا ایک ایسا مرکب تشکیل دیتے ہیں جو کافی عمدہ تہہ دار اور کثیر الجہت ہوتا ہے جن میں کسی ایک محرک کو ہی ہجرت کی اصل وجہ سمجھنا سہل پسندی کے علاوہ

کچھ نہیں۔''(2)

جن ممالک کی آبادی مختلف مذہبی، لسانی، نسلی اور تہذیبی گروہوں پر مشتمل ہوتی ہے وہاں کی صورتحال کافی پیچیدہ ہوتی ہے اور ایسے میں ملک کے سیاسی نظام کا رول خاصا اہم ہو جاتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم سے قبل کی یورپی سیاست نے ایسی فضا تیار کی جو بالآخر جنگ پر منتج ہوئی اور ایک نقل مکانی اور ہجرت کو مجبور ہوگئی۔ اسی طرح برصغیر کی بڑی آبادی اس وقت کی ملکی سیاست کے سبب نقل مکانی سے دوچار ہوئی۔ ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش بنا۔ یہ امر طے شدہ ہے کہ ہجرت کے لیے فضا اکثر علاقائی، ملکی اور بین الاقوامی سیاست ہی تیار کرتی ہے۔

ہجرت زندگی کا سب سے تکلیف دہ پہلو ہوتا ہے۔ اپنے وطن، اپنی زمین اور اپنے گھر بار کو الوداع کہنا، رشتہ داروں سے جدائیگی اختیار کرنا انتہائی دشوار اور مشکل ترین لمحہ ہوتا ہے لیکن انسانی زندگی میں پیش آمد مسائل کے پیش نظر ایک انسان کو یہ سب مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ زندہ رہنے کی آس اس میں اپنے حقیقی وطن کی نم آنکھوں کے ساتھ الوداع کہہ کر وہ کسی نئے ٹھکانے کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ جہاں کہیں جگہ ملتی وہیں بود و باش اختیار کر لیتا ہے۔ ہجرت کا یہ سلسلہ طویل عرصے سے جاری ہے۔ ہر دور میں مختلف لوگوں نے مختلف وجوہات کے سبب ہجرت کر کے دوسری جگہ رہائش اختیار کی ہے۔ آج بھی ہجرت دنیا کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔

ہجرت کے اسباب و وجوہات اور مسائل پر ہر زمانے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ادبا و شعرا و صحافی اور مؤرخین نے اپنے اپنے زمانے کے مہاجرین کے درد کو بیان کیا ہے۔ تقسیم ہند کے پس منظر میں ہجرت کے مسائل پر بہت زیادہ خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ملک کے بٹوارے کے بعد ہندستان، پاکستان میں ہجرت کا تسلسل قائم تھا۔ ادھر کے لوگ ادھر اور اُدھر کے لوگ ادھر ہجرت کر رہے تھے۔ تقسیم وطن نے برسوں کے ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ ایسے ماحول میں لاکھوں لوگوں کو اپنا محبوب وطن چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہونا پڑا۔ خواتین کی عصمت و عزت لوٹی جا رہی تھی۔ ہر کوئی دوسرے کے خون کا پیاسا تھا۔ یہ وجوہات تھیں جس سے لوگوں کو اپنی جائیداد، دولت اور سب کچھ قربان کر کے ترک وطن پر مجبور کر دیا۔ ناول نگار، افسانہ نویس اور صاحب فکشن نے تقسیم وطن کے پس منظر میں ہجرت کے اسباب پر بہت کچھ لکھا۔ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں

میں تمام دیگر مسائل کی طرح ہجرت کے موضوع پر بھی لکھا گیا۔

جہاں تک اردو زبان وادب کا تعلق ہے تو شاعری اور نثر میں دیگر مسائل کی طرح ہجرت کے المناک کے سانحے پر بہت کچھ لکھا گیا۔ کئی شاہکار ناول اور افسانے تخلیق کیے گئے۔

اردو فکشن میں ہجرت

1947 کے بعد دو دہوں میں اردو فکشن میں سب سے زیادہ تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات اور ترک وطن جیسے مسائل کی عکاسی ہوئی۔ اردو کے زیادہ تر فکشن نگار دو قومی نظریے اور تقسیم کی سیاست کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پائے۔ تقسیم کے نتیجے میں ایک بڑی آبادی ترک وطن کر کے ہندستان یا پاکستان ہجرت کر گئی۔ ہجرت کے سفر میں جن مصائب و مظالم کا انھیں سامنا کرنا پڑا اس نے ہجرت کے عمل کو متعلقہ افراد کے لیے انتہائی تکلیف دہ، پر آشوب اور کربناک بنا دیا۔ مہاجروں کی ایک بڑی تعداد سرحد کے دونوں اطراف بالکل نئی نئے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی صورتحال سے دوچار رہی۔ اردو فکشن میں مہاجروں اور ان کی زندگی اور ان کے مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اس وقت کے عام لوگوں کے علاوہ جتنے بھی فنکار تھے ان فسادات سے متاثر ہوئے اور اس بات کا ثبوت ان کے فن پاروں میں دیکھنے کو ملتا ہے، جن کی فہرست طویل ہے لیکن یہاں ان میں سے کچھ اہم فن پاروں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

ہجرت کے موضوع پر لکھے گئے نمائندہ ناول:

''اداس نسلیں'' (عبداللہ حسین)

''آنگن'' (خدیجہ مستور)

''زمین'' (خدیجہ مستور)

''دو گز زمین'' (عبدالصمد)

''زندہ محاورے'' (ناصر شرما)

''ٹوٹا ہوا آدمی'' (خالد سہیل)

''مقدس جیل'' (خالد سہیل)

''خواب رو'' (جوگندر پال)

''اداس نسلیں'' عبداللہ حسین کا ناول ہے، جس میں انھوں نے پہلی جنگ عظیم سے لے کر قیام پاکستان کے دور تک احاطہ کیا ہے۔ اس ناول میں اس عہد کی ہندستانی سیاست کے سبھی اہم واقعات کو اہمیت دی گئی ہے، لیکن قیام پاکستان اور اس کے نتیجے میں ہجرت کے حادثے کو جس فنی چابکدستی سے بیان کیا گیا ہے اس میں نہ صرف اس کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے بلکہ ہجرت کرنے والوں کے المیے کا احساس بھی شدت سے ہونے لگتا ہے۔

ہندستان میں فسادات تو قیام پاکستان سے قبل بھی ہوا کرتے تھے تب مخصوص مقامات اور محدود پیمانے پر ہی ہوا کرتے تھے لیکن تقسیم ہند کے دوران نفرت کی آندھی اس طرح چلی کہ دیکھتے ہی دیکھتے فسادات کا سلسلہ عام ہوگیا۔ ''آنگن'' خدیجہ مستور کا ناول ہے جو 1962 میں منظر عام پر آیا۔ اردو حلقے میں اس ناول کی کافی پذیرائی ہوئی۔ اس ناول کے تمام حالات و واقعات ناول کے مرکزی کردار عالیہ کے ذہن کے کینوس پر رونما ہوتے ہیں۔

> ''تو کیا سارے مسلمان پاکستان جا کر رہیں گے؟''
> بڑی چچی نے پوچھا۔
> ''واہ اس کی کیا ضرورت پڑے گی، جو جہاں ہے وہیں رہے گا۔ مگر ہندو ہمیں رہنے کیوں دیں گے، وہ نہیں کہیں گے کہ آپ اپنے ملک جاؤ۔''
> ''ان کے ہندو جو ہمارے پاکستان میں ہوں گے ہم ان سے کب کہیں گے کہ جاؤ۔''
> ''جمیل بھیا کی دلیل بڑی چچی کی سمجھ میں آ گئی تو انھوں نے اطمینان کی سانس لی۔''
> ''ہاں جمیل میاں یہ جانے والی بات بری ہے میں بھی یہ گھر نہیں چھوڑ سکتی۔''(3)

خیر یہ تو عام لوگوں کے خیالات و جذبات تھے لیکن سیاستدانوں کی منشا کچھ اور تھی اور ویسا ہی ہوا جس کے نتیجے میں لاکھوں لوگوں کو اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ نئے ملک میں جا کر رہنا اور وہاں اپنی بنیادی ضروریات کو پورا

کرنا بہت مشکل کام تھا۔اس کے بعد وہاں ان کو مہاجروں کی طرح رہنا پڑا۔ان کی خارجی اور داخلی زندگی یعنی کہ خارجی طور پر وہ نئے ملک میں رہتے ہیں لیکن باطنی طور پر اپنے ملک کی یادیں ہوتی ہیں۔ہجرت کے بعد مہاجروں کی زندگی میں یہی سب سے بڑی الجھن رہی جس سے وہ ایک عرصے تک نبرد آزما رہے۔

''زمین'' خدیجہ مستور کا دوسرا ناول ہے،جس کے کردار مہاجرین ہیں۔اس ناول کا بنیادی سروکار اس معاشرے کی عکاسی ہے جو قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے شہروں میں وجود میں آیا اور جس کی اساس بے ایمانی،فریب،ہوس دولت اور استحصال پر قائم ہے۔اس ناول کا اہم پہلو مہاجر عورتوں کا جنسی استحصال ہے۔

تقسیم ہند کے زمانے میں رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران عورتوں پر جو مظالم ہوئے یہ بھی ایک کربناک پہلو ہے جس سے ساری انسانیت شرمناک ہوجاتی ہے۔''دوگز زمین'' عبدالصمد کا ناول ہے جس میں انھوں نے ہندستان کی سب سے بڑے اقلیتی فرقے کو اپنا موضوع بنایا۔بیسویں صدی میں برصغیر کے مسلمان فرقہ وارانہ سیاست اور تقسیم ملک کے حوالے سے جن جن حالات سے دوچار ہوئے،اس ناول میں پورے منظر کو ضلع بہار شریف کے مسلمان خاندان کے توسط سے بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ناول کا آغاز جدوجہد آزادی کے حالات و واقعات سے ہوتا ہے۔ناول ''دوگز زمین'' میں تقسیم کی زیادہ تر ذمہ داری مسلم لیگ اور انگریزوں پر عائد کی گئی ہے جو حقیقت بھی ہے۔الیکشن کے بعد سارے علاقے کی فضا مسموم ہوگئی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی بنیادوں پر گھر گھر تقسیم ہوگئے۔ ہندو اور مسلمانوں کا امتیاز لوگوں کے درمیان جگہ جگہ اپنا ان دَیکھا ہیولیٰ کھڑا کرتا پھر رہا تھا۔پنجاب اور بنگال کے بہت سے علاقوں میں کئی ہندو مسلم فسادات ہو چکے تھے جن کا یہاں خوب خوب ذکر ہوا تھا۔مسلم لیگ والے تو پاکستان کا خواب دکھا کر جا چکے تھے۔ان کے جانے کے بعد ہندو مہاسبھا نے ان کے اس خواب کی ایک بھیانک تعبیر کو ہر ہندو گھر میں پہنچانے کا ذمہ لیا تھا۔

''زندہ محاورے'' ناصرہ شرما کا ناول ہے جو کئی اعتبار سے اہم ہے۔اس ناول میں جہاں ایک طرف پاکستان ہجرت کرنے والوں کی زندگی اور ان کے مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے اور وہیں دوسری جانب ان افراد کی روداد زندگی بھی بیان کی گئی ہے جو تقسیم ہند کے بعد ہندستان میں ہی رہ گئے تھے۔ناول میں اس صورتحال کو بھی فنی مہارت سے پیش کیا گیا ہے جو مہاجروں کو نئے ملک میں رچنے بسنے میں مسائل کی صورت میں درپیش آتے ہیں۔

''ٹوٹا ہوا آدمی'' اور ''مقدس جیل'' خالد سہیل کے دو ناولٹ ہیں جو ہجرت اور اس سے پیدا شدہ حالات کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ یہ ناولٹ فنی اعتبار سے ذرا کمزور ہیں لیکن موضوع و مسائل کی سطح پر چند اہم معاملات کا احاطہ کرتے ہیں۔

جوگندر پال کا ناول ''خواب رو'' جس کا بنیادی موضوع دو تہذیبوں کے مابین آمیزش اور ٹکراؤ ہے۔ ہر جغرافیائی خطے میں تھوڑا بہت فرق اور وسیع تہذیبی نظام جاری و ساری رہتا ہے۔ اس تہذیبی نظام میں معاشرتی، لسانی اور تہذیبی نظام جاری و ساری رہتا ہے۔ اس تہذیبی نظام میں معاشرتی، لسانی اور اقتصادی پہلو قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہجرت کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں کی طرح لاتعداد افسانے بھی لکھے گئے ان میں بعض ایسے افسانے ہیں جو اس موضوع پر شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں جن میں چند مندرجہ ذیل ہیں:

''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' (سعادت حسن منٹو)

''لاجونتی'' (راجندر سنگھ بیدی)

''یا خدا'' (قدرت اللہ شہاب)

''جلاوطن'' (عبداللہ حسین)

''گرین ہاؤس'' (جوگندر پال)

''فاختائیں'' (جوگندر پال)

''یکے بود یکے نبود'' (زاہدہ حنا)

''ڈار سے بچھڑے'' (سید محمد اشرف)

''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' تقسیم ہند اور نقل مکانی کے موضوع پر ایک بہترین افسانہ ہے جس میں منٹو نے فنی چابکدستی سے اس وقت کے حالات کو پیش کیا ہے۔ اس افسانے کے کردار پاگل ہیں جو پاگل خانے میں ہیں اور جب ان کو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں یا پاکستان بھیجا جائے گا تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ یہ ہندستان یا پاکستان کہاں ہے؟ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم ہندستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے؟ اور اگر ہم پاکستان

میں ہیں تو ہندستان کہاں ہے؟ وہ پاگل عجیب حرکتیں کرنے لگے۔کوئی درخت پر چڑھنے لگا،کوئی کہنے لگا کہ مجھے نہ ہندستان جانا ہےاور نہ پاکستان، مجھے اسی درخت پر رہنا ہے۔اسی طرح بشن سنگھ نامی ایک پاگل جس کا گاؤں ٹوبہ ٹیک سنگھ ہے وہ بھی اس بات کو لے کر پریشان ہے کہ اس کا گاؤں ہندستان میں ہے یا پاکستان میں؟ جب ہندستان کو بھیجا جانے لگا تو وہ سرحد پر جہاں دونوں کی زمین کا ایسا حصہ جسے No Man's Land کہا جاتا ہے وہاں کھڑا ہوگیااور برسوں سے وہ اکثر کھڑا رہتا تھااور بعد میں دیکھا گیا کہ وہ وہیں گر گیااور مر گیا۔

یہ افسانہ دراصل منٹو نے پاگل کرداروں کے ذریعے سمجھ دار، ذمہ داراور سیاست دانوں پر طمانچہ ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت کی اکثر عوام کو دوقومی نظریے کا علم نہ تھااور نہ ہی تقسیم یا ہجرت کا خیال لیکن سیاستدانوں نے اپنی کرسی کے لیے عوام کو ایک دوسرے کا دشمن بنالیا۔ ہر طرف فسادات ہونے لگےاور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی اور لاکھوں لوگوں کو ہجرت کرنی پڑی۔ ہزاروں لوگوں کا قتل ہوا۔

''لاجونتی'' راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ہے جو تقسیم ہنداور فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں رونما ہونے والا ایک نفسیاتی المیہ ہے۔فسادات کے دوران عورتوں،لڑکیوں کی عصمت دری ہوئی۔ایک اور طبقہ عورتوں کا ایسا تھا یا تو جن کے رشتے داراور تمام لوگ مارے گئے یا ہجرت کر گئے ان وہ تن تنہا نامساعد حالات کا سامنا کرنے کے لیے اکیلی رہ گئیں۔ایسی عورتیں جنسی استحصال کا شکار ہوئیں اور ایسی عورتوں کی تعداد بھی کافی تھیں جنھیں اغوا کر کے سرحد کے اس پار یا اس پار لے جایا گیا اور انھیں مجبور کیا گیا کہ وہ دوسرے فرقے کے اجنبی مرد کے ساتھ گھر بسائیں۔ایسی بھی عورتیں تھیں جو ہجرت کے سفر میں ادھر ادھر ہو گئیں اور بعد میں رضا کار تنظیموں نے ایسی عورتوں کو ان کے رشتے داروں تک پہونچایا۔ایسی تنظیموں کا نعرہ تھا''دل میں بساؤ''۔اس تنظیم کا سکریٹری سندر لال بابو کو بنایا گیا کہ خود ان کی بیوی لاجونتی اغوا کر لی گئی تھی۔اس دوران ان عورتوں کو کچھ گھروں میں قبول کیا گیا لیکن کچھ لوگ ان کو گھر میں لانا اپنی بے عزتی سمجھتے تھےاور ان کے شوہر، والد وغیرہ ان کو پہچاننے سے انکار کرنے لگے،اسی طرح بہت سے لوگوں نے قبول لیکن ان کو حق زوجیت سے محروم رکھا۔

ان کے علاوہ قدرت اللہ شہاب کا طویل افسانہ''یاخدا'' جس میں انھوں نے تقسیم ہند،فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کے پس منظر میں بے سہارا عورتوں کا جنسی استحصال اور پامالی کو بخوبی بیان کیا ہے۔

جوگندر پال کا افسانہ ''فاختائیں'' جس میں انھوں نے ایک ایسے شخص کے حالات بیان کیے ہیں جو فسادات کے دوران پاکستان سے دہلی آیا۔ پہلے وہ ایک استاد تھا اور اب یہاں ٹیکسی چلاتا ہے۔ یہاں اس کی بیوی وفات ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی زندگی یہیں بسر کرتا ہے لیکن وہ اپنی زمین سے دوری کو جذباتی سطح پر کبھی بھی قبول نہیں کر پاتا۔

افسانہ ''یکے بود یکے نبود'' زاہدہ حنا کا افسانہ ہے، جس میں انھوں نے ایک ایسے خاندان کی کہانی کو بیان کیا ہے جنھیں ہجرت در ہجرت کرنی پڑتی ہے اور آخر موت نے شاہ پور کی ہجرت در ہجرت کے دنیاوی آواگون سے نجات دلا دی۔

''ڈاڑ سے بچھڑے'' سید محمد اشرف کا افسانہ ہے، جس کا موضوع وہ مہاجرین ہیں جو نئے ملک میں بظاہر پرسکون زندگی گزارتے ہیں لیکن ان یادوں کو پیچھے نہیں چھوڑ پاتے جو ہجرت سے پہلے ان کی زندگی سے وابستہ رہی ہیں۔ ان کے دلوں میں سابقہ زمین سے محبت کا جذبہ روشن ہے لیکن وہ ذاتی یا سیاسی وجوہات کے سبب اپنے سابقہ ملک جانے سے قاصر ہیں۔

اسی طرح ہجرت کے مسائل پر کئی افسانے اور ناول تخلیق کیے گئے اور اتنا ہی نہیں شاعروں اور دیگر فنکاروں نے بھی دیگر مسائل کی طرح ہجرت کے موضوعات پر مختلف تخلیقات پیش کیں اور ہجرت کے ہر پہلو کو بخوبی پیش کیا۔ اردو کے دیگر فنکاروں کی طرح انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر نے بھی ہجرت کے المیے پر کئی ناول اور افسانے تحریر کیے۔

اردو فکشن میں قرۃ العین حیدر کا نام اہم ہے۔ تقسیم ملک اور ہجرت برصغیر ہندو پاک کی تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ یہ درد و کرب قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے بخوبی اجاگر ہوا ہے۔ ہجرت کے حوالے سے یہ اہم بات ان کی تخلیقات میں نمایاں اہمیت رکھتی ہے۔ انسان جب ہجرت کرتا ہے تو وہ صرف ایک خطہ یا زمین سے نقل مکانی نہیں کرتا ہے بلکہ وہ اپنے پورے تہذیبی سیاق و سباق سے جلاوطن ہو جاتا ہے۔ تہذیبی حوالگی سے محرومی قرۃ العین حیدر کے یہاں ہجرت کا مسئلہ ہے۔ قرۃ العین حیدر کے دو ابتدائی ناول ''میرے بھی صنم خانے'' اور ''سفینۂ غم دل'' میں تقسیم ہند سے قبل کی تہذیب کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول ''آگ کا

دریا'' قرۃ العین حیدر کا شاہکار ناول ہے، جس میں ہندستان کی ڈھائی ہزار کی تہذیب کو زمانی تسلسل میں پیش کیا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں ہجرت اور اس سے پیدا شدہ صورتحال کی عکاسی میں گہری فنی مہارت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان کے افسانے ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' میں مہاجر کردار ہے۔ ان کو یہ شدید احساس روحانی اعتبار سے کھوکھلا کر دیتا ہے اور اس کی شخصیت انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔

انتظار کے یہاں کے ہجرت کا تصور مختلف ہے۔ ان کے نزدیک ہجرت محض سرحد پار کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک بستی سے دوسری بستی کی جانب جانے کا نام بھی ہجرت ہے۔ دراصل اپنی ذات کے مرکز سے ہجرت کے مترادف ہے۔ مرکز سے ہجرت کے سبب ہی مہاجروں کی زندگی میں انتشار اور بے جڑی گھر کرنے لگتے ہیں۔

انتظار حسین کی تخلیقات کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ ہجرت کے کسی مخصوص تاریخی واقعے کو ہی ذمہ دار نہیں ٹھہراتے ہیں بلکہ ہجرت کی تہہ میں کارفرما اسباب کا وسیع تہذیبی پس منظر میں جائزہ لیتے ہیں۔

ہجرت کے موضوع پر ''بستی'' انتظار حسین کا سب سے مشہور ناول ہے۔ اس ناول میں انھوں نے مہاجروں کے مختلف مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ خاص کر زمین کے ہجرت کے عمل میں متعلقہ افراد کی شخصیت دونیم ہو جاتی ہے۔ ماضی اور اس سے وابستہ مظاہر سابقہ ملک میں ہی رہ جاتے ہیں اور جب حال سے ماضی کٹ جائے تو فرد کی سلیمیت مجروح ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ نئے ملک کے اقدار و اطوار سے مفاہمت سے پیش آنے والی دشواریوں کو بھی اس ناول میں بیان کیا گیا ہے۔

''تذکرہ'' اور ''چاند گہن'' انتظار حسین کے ناول ہیں۔ ''تذکرہ'' انھوں نے ہجرت کے تجربے کو 'اخلاق' کے خاندانی پس منظر میں بیان کیا ہے۔ چونکہ ان کے خاندان میں ہجرت کی ایک قومی روایت موجود ہے۔ ''چاند گہن'' میں انتظار حسین نے ہندستان سے ہجرت کر کے پاکستان جانے والے مہاجرین اور ان کے حالات و واقعات کو پیش کیا ہے۔ ان کا ناول ''آگے سمندر ہے''، جس میں انھوں نے تقسیم کے وقت ہندستان سے ہجرت کر کے پاکستان جانے والے افراد، اشخاص اور خاندان کے مسائل، طرز معاشرت، ان کے ذہنی و جذباتی کوائف

کا احاطہ کیا ہے۔ انتظار حسین نے ہجرت کے باطنی اثرات اور داخلی عمل اور نتائج کو مرکزی اہمیت دی ہے۔

اسی طرح انتظار حسین کے افسانوں میں بھی ہجرت کے موضوعات ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے قیام بنگلہ دیش اور اس سے متعلقہ لوگوں کی ہجرت کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ افسانہ ''خواب اور تقدیر'' میں انتظار حسین نے حالات سے گھبرا کر ایک پرامن ملک کی جانب مسلمانوں کی ہجرت کی خواہش کو موضوع بنایا ہے۔ تقدیر کی ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں وہ ملک بعد میں ان کے لیے تنگ ہو جاتا ہے۔ ''اندھی گلی'' میں انتظار حسین نے بنگلہ دیش سے بھاگ کر ہندستان آنے والے دو افراد کی شناخت کی گمشدگی کو موضوع بنایا ہے۔ اسی طرح ''شہری افسوں'' کا مرکزی خیال یہ ہے کہ جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں تو کوئی بھی زمین انھیں قبول نہیں کرتی۔ ''نرناری'' میں انتظار حسین نے ہجرت کے بعد انسان اجنبی مٹی سے جڑ تو جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ مکمل وحدت و ہم آہنگی نہیں قائم کر پاتا ہے۔

جہاں تک ریاست جموں و کشمیر کا تعلق ہے آزادی سے پہلے ملک کی دیگر ریاستوں کی طرح وہاں بھی خود مختار صوبائی ریاست تھی۔ مختلف ادوار میں وہاں الگ الگ حکمران رہے ہیں۔ قدیم دور میں ہندو حکمرانوں نے حکومت کی اور پھر دورِ وسطیٰ میں مسلم حکمران آئے۔ مغلوں اور افغانوں کے بعد سکھوں نے حکومت کی اور آخر میں ڈوگرہ حکمران آئے جنھوں نے 1947 تک حکومت کی۔ ملک کی آزادی کے بعد دیگر ریاستوں کا ملک میں باضابطہ الحاق ہوا لیکن جموں و کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ نے ایسا نہیں کیا۔ وہ آزاد رہنا چاہتے تھے۔ ایک طرف پاکستان کا قیام اور دوسری طرف ہندستان۔ ریاست جموں و کشمیر ان دونوں کی زد میں آ گئی اور ہندستان تو ملک کے دیگر مسائل کو الجھا رہا تھا اس کا فائدہ پاکستان نے اٹھانا چاہا اور کچھ قبائلیوں کے ساتھ اپنی ملک کی فوج کو بھی جموں و کشمیر پر حملہ کرنے کو بھیجا۔ جب انھوں نے جموں و کشمیر میں قتل عام شروع کیا تو مہاراجہ کو مجبوراً ہندستان سے مدد مانگی پڑی لیکن ہندستان نے اس کے لیے یہ شرط رکھی کہ ریاست کا ہندستان کے ساتھ باضابطہ الحاق کیا جائے۔ بعد میں ایسا ہی کیا گیا۔ مہاراجہ نے باضابطہ Intrument of Accession جو ایک تاریخی دستاویز ہے، جس کے تحت ریاست جموں و کشمیر کا ملک کے ساتھ الحاق کیا اور ہندستانی فوج نے جموں و کشمیر سے پاکستانی منصوبے کو ناکام کیا۔ اس کے بعد ریاست میں بھی ہندستان کے آئین کے تحت عمل

درآمد ہونے لگا۔ شیخ محمد عبداللہ جو اس کے لیڈر تھے مہاراجہ نے انھیں ہنگامی منتظم (Emergency Administrator) بنایا، لیکن وہ بعد میں اتنے مشہور ہوئے اور سیاست میں آ گئے اور مسلم کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد دیگر پارٹیاں بھی وجود میں آئیں۔ ان سیاسی پارٹیوں کے علاوہ علیحدگی پسند نظریے کے کچھ لوگ بھی سامنے آئے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہاں کے حکمرانوں کی بربریت اور استحصال سے عوام تنگ آ چکی تھی اور اس کے خلاف انھوں نے اپنی آواز بلند کرنی شروع کر دی تھی اور شیخ محمد عبداللہ جن کی نمائندگی کر رہے تھے۔ لیکن بعد میں انھوں نے سیاسی پارٹی جس کا ذکر پہلے کیا گیا 'مسلم کانفرنس' نہرو کے کہنے پر جسے 'نیشنل کانفرنس' کا نام دیا گیا۔ اس کے علاوہ پی ڈی پی سیاسی پارٹی بنی۔ گو کہ وہاں کی خاص سیاسی پارٹیاں ہیں۔

اس طرح ہندستانی آئین کے تحت وہاں جمہوری نظام قائم ہوا۔ پاکستان میں جموں و کشمیر کو حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش شروع کر دی اور اسے اپنا مقصد بنا لیا۔ اس کے لیے پاکستان نے چار بار جنگ کی لیکن ان کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے ساتھ ہی دہشت گردی کا ایسا ماحول قائم کر دیا جس سے صرف جموں و کشمیر میں ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر میں بدامنی، دہشت، خوف اور ابتری پھیل گئی اور یہ مسئلہ بین الاقوامی سطح پر عام ہوا۔ اس کے علاوہ ہندستان، پاکستان اور پورے برصغیر میں دیگر کئی مسائل رہے اور آج تک عوام جن سے دوچار ہو رہی ہے، لیکن مسئلۂ کشمیر جو کہ 1947 سے لے کر آج تک اس کا کوئی حل نہ ہو سکا۔ اگر چہ قومی و بین الاقوامی سطح پر کئی معاہدے اور میٹنگیں ہوئیں۔ ہندستان جو کہ بہت بڑا ملک ہے اور جس کے بہت سے اندرونی مسائل ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں بھی کئی اندرونی مسائل ہیں لیکن وہ ان مسائل کو نظر انداز کر کے کشمیر حاصل کرنے کی ضد پر اڑا ہوا ہے۔ جب پاکستان کو ہر طرف سے ناکامی ہونے لگی تو انھوں نے اس مسئلے کو مذہبی رنگ دے دیا کیوں کہ جموں و کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس لیے انھوں نے کشمیر کی عوام کے سامنے اور خاص کر انتہا پسندوں کو کشمیر میں اسلامی حکومت کا بھروسہ دیا اور ان کو ہندستان کے خلاف کر دیا۔ کشمیر میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی رہتے تھے جن کی وجہ سے پاکستان اور کشمیر کے انتہا پسندوں کا مقصد کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن انھوں نے ایک سازش کے تحت کشمیری پنڈتوں کو نشانہ بنایا اور ان کا قتل عام کرنے لگے۔ ان کو ہر طرح سے خوف زدہ کیا گیا چونکہ 1947 سے 1980 تک کے وقفے میں کشمیر کے انتہا

پسندوں نے وہاں کے عوام اور خاص طور سے نوجوانوں کو اسلامی حکومت قائم کرنے اور جہاد کرنے پر آمادہ کیا۔ وہاں کے نوجوانوں نے ہتھیار اٹھائے اور پاکستان کے مقصد کو پورا کرنے لگے۔ کشمیری پنڈتوں کا نہ صرف قتل عام کرنے لگے بلکہ ان کو ہر طرح سے خوفزدہ بھی کیا جانے لگا۔ مسجدوں سے اذان کی جگہ تعصّباتی تقریریں کی جانے لگیں۔ پنڈتوں کے گھروں کے دروازوں پر دھمکی بھرے پوسٹر لگائے کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ اور جلوس نکالے جانے لگے۔ اس میں بہت ہی خوفناک نعرے دیئے جاتے تھے۔ ''ہم کیا چاہتے آزادی، آزادی کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ۔ یہاں کیا چلے گا نظام مصطفیٰ۔'' اس کے بعد وہاں پر قتل ہونے لگا جو کل تک ان کے پڑوسی تھے دشمن بن گئے۔ ایسی صورتحال میں انھیں سب کچھ چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور جموں و ملک کے دیگر حصوں میں رہنے پر مجبور ہوئے۔ کہاں کشمیر کی دلکش آب و ہوا اور پھر کہاں جموں و دیگر ملکوں کا درجۂ حرارت اور آب و ہوا۔ ان کو اپنے ہی ملک میں شرنارتھی کی طرح رہنا پڑا اور وہاں کئی لوگوں کی موت سانپ کے کاٹنے اور دیگر مسائل سے ہوئی لیکن جو لوگ مالی طور پر ٹھیک تھے انھوں نے ریاست کے باہر پناہ لی اور وہیں آباد ہو گئے۔

آج ملک کی آزادی کو ستر سال اور کشمیری ہنڈتوں کی ہجرت کو 27 سال گزر جانے کے بعد بھی وہاں امن و سکون تو کیا انتہا پسندی کے عمل اور ردعمل میں اضافہ ہو گیا ہے اور جسے زمین پر جنت کہا جاتا ہے آج زمین پر جہنم سے کم نہیں۔ ان تمام حالات کو صحافیوں اور تاریخ نویسوں کے علاوہ دیگر فنکاروں نے بھی بخوبی اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ ریاست کے دیگر فنکاروں میں آنند لہر کا بھی اہم نام ہے۔ انھوں نے وقتی حالات سے متاثر ہو کر افسانے، ناول اور ڈرامے تصنیف کیے۔ ان کے علاوہ دیگر زبانوں کے فنکاروں نے بھی ان حالات کا بخوبی جائزہ لیا۔

آنند لہر نے مختلف مسائل اور موضوعات پر افسانے، ناول اور ڈرامے تخلیق کیے، جس میں انھوں نے وقتی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی ہجرت کے مختلف پہلوؤں کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

آنند لہر کا افسانہ ''برف ابھی سفید ہے'' ان کے افسانوی مجموعے ''کورٹ مارشل'' میں شامل ہے، جس میں انھوں نے کشمیر کے موسم اور بھائی چارے کی جھلکی کو پر لطف انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں ایک نوجوان جو کالج کا طالب علم ہے جس کا نام کمل ہے، اس کی ملاقات نشا نامی لڑکی سے ہوتی ہے۔ وہ دونوں ملتے

ہیں اور شکارے پر ڈل میں گھومتے ہیں۔ اس کہانی میں ایک اور کردار حسن ہے جو شکارہ چلاتا ہے وہ بھی نعیم نامی لڑکی سے محبت کرتا ہے لیکن بدقسمتی سے اس کا والد نعیم کی شادی کسی اور لڑکے سے کر دیتا ہے۔ کمل کی دوستی اس دوران حسن سے ہو جاتی ہے اور کمل اور نشا اس کے شکارے میں دن بھر گھومتے ہیں۔ وہاں کی خوبصورت آب و ہوا اور فضا کی باتیں کرتے ہیں۔ ایک دن حالات ایسے بدلے کہ نشا کے گھر والے آئے اور اسے لے گئے اور کمل کو اس کے والدین کے ساتھ جموں آ کر شرنارتھی کیمپ میں رہنا پڑا۔ اپنے گھر سے بے گھر ہو گیا اور ہر طرف گھٹن کا ماحول تھا۔ ان کیمپوں میں ایک الگ ہی طرح کی دنیا آباد تھی جو کبھی کشمیر کی وادی میں آباد تھے اور یہاں گرمی و دھول میں اپنی زندگی گزارنے لگے۔ اس دوران کشمیر میں مختلف قسم کی آوازیں ابھرنے لگیں۔

''آزادی لے کے رہیں گے''

''خاک آزادی ملے گی۔''

''ہم تو آزاد ہیں کسی کے غلام نہیں۔''

''الیکشن کی بے ایمانی کی وجہ سے اُگرواد پھیلا''۔

''نہیں رشوت کی وجہ سے۔''

''ایک مہینے کے اندر حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''ہم کسی بھی بیرونی حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔''(3)

ان آوازوں کے بیچ وہاں کی آب و ہوا، خوبصورتی، قدرت کے دلکش مناظر، رِشی منیوں اور صوفی سنتوں کی تہذیب دب گئی تھی۔ حسن کمل کے گھر کو بچانے گیا تو اس کے ہاتھ جلا دیئے اور پھر حسن کا گھر بھی جلا دیا گیا یعنی کہ وہاں اس وقت ایک طرف سیاسی پارٹیاں تھیں اور دوسری طرف علیحدگی پسند حریت کے رہنما اور بیچ میں وہاں کی عوام جن میں کشمیری پنڈتوں کا اپنی جان بچانے کے لیے مجبوراً ہجرت کرنی پڑی۔ اس کے بعد وہاں صرف مسلم ہی رہے لیکن پھر بھی لوگوں کی الگ الگ رائے تھی۔ سیاسی نیتاؤں کی اپنی اور مذہبی ٹھیکے دار اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ لیکن عوام پر پھر بھی وہی ظلم و ستم ہوتا رہا۔ ایک طرف کراس فائرنگ اور گھروں کی تلاشی عام ہونے لگی اور دوسری طرف دہشت گرد وہاں اپنے لیے پناہ بھی ڈھونڈنے لگے اور جو لوگ انھیں پناہ دیتے ان کی خیر ہوتی لیکن اگر کوئی انکار کرتا تو اسے سرعام گولی مار دی جاتی یا انھیں تڑپا تڑپا کر مار دیا جاتا۔ انسانیت

شرمسار ہورہی تھی۔ کشمیری پنڈتوں کو اس بات کا شدید دکھ ہوا اور یہ دکھ ان کو آج تک ستاتا ہے کہ وہاں کے لوگوں نے، ان کے ہمسایوں نے جو کل تک ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے انھوں نے ان کو روکا تک نہیں اور ان کے حق میں ایک الفاظ تک نہ کہا۔ خاموشی سے نظارہ دیکھنے اور حد کی بات تب ہوئی جب دہشت گرد پنڈتوں کے گھروں ان کا قتل کرنے آتے اور اگر وہ جان بچا کر کہیں چھپ جاتے تو ان کے مسلم پڑوسی دہشت گردوں کی مدد کرتے اور بتاتے کہ وہ کہاں چھپے ہیں اور وہیں ان کا قتل کیا گیا۔ انجینئر ٹیکہ لال ٹپلو جسے چاول کے ڈرم میں ہی مارا گیا۔ ایک عرصے بعد وہاں حالات میں کچھ سدھار آیا اور پھر وہاں کے سیاسی رہنما بیان دیتے رہے اور دعوت دینے لگے اور یہ امید کرنے لگے کہ یہاں کی فضا اور آب وہوا اب بھی دلکش ہے۔ ''برف اب بھی سفید ہے'' جو اس افسانے کا موضوع ہے۔ جہلم اور ڈل کی بات بھی کہی۔

مصنف نے یہ بات بڑے دلکش انداز میں کی ہے کہ نشانے کمل کو خط لکھا اور بتایا کہ حسن تمہیں خوش آمدید کہنے کو تیار ہے۔ تمہارے آنے سے یہاں یقین پیدا ہوگا۔ افسانہ نگار نے فنکارانہ انداز میں ان حالات کو بیان کیا ہے لیکن انھوں نے دوبارہ وہاں سے انکار کر دیا کیوں کہ اسے کہیں سے بھی تحفظ کی امید نہیں تھی۔

''ایک اور ہجرت'' آنند لہر کا افسانہ ہے جس میں انھوں نے ہجرت کو موضوع بنایا ہے جس میں انھوں نے کشمیری پنڈتوں کے ایک ایسے گھر کو موضوع بنایا ہے جس کا کردار شمبھو ناتھ ہے۔ وہ جب جوان تھا اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ نوکری بھی لگ گئی تھی۔ اس کا والد فقیر چند پرانے گھر میں رہنا چاہتا تھا جو اس کے بزرگوں کا بنایا ہوا تھا۔ شمبھو نے وہاں اپنا بچپن گزارا تھا۔ اور وہ وہاں کھیلتا رہتا تھا۔ حالات اس طرح خراب ہوئے کہ ان کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ جب وہ ہجرت کر رہے تھے تو ان کے گھر کی تمام چیزیں احتجاج کر رہی تھیں۔ اس کے بعد وہ وہاں سے چلے آئے اور دوسری جگہ آباد ہو گئے جہاں کی آب وہوا وہ برداشت نہیں کر پائے۔ اس کے علاوہ جیسے فقیر چند آم کھانے لگا تو گٹھلی اس کے گلے میں پھنس گئی۔ آم یعنی کہ کشمیر کا پھل نہیں لیکن مجبوری میں کھانا پڑا اور جب اس نے چپاتی کھائی تو اس کے منہ میں چھالے پڑ گئے۔ اسی طرح دن گزرتے گئے اور کچھ عرصہ بعد یہ خبر آنے لگی کہ واپسی ہوگی اور ایک امید کی کرن نظر آنے لگی۔ ان کے بچے بھی بڑے ہو گئے تھے اور اسکولوں میں ان کا داخلہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے گھروں میں ایک جنریشن گیپ آ گیا تھا۔ ایک خاموش سا تضاد ان

کے گھر میں شروع ہو گیا جیسے دیپک کو آم کھانے پسند تھے مگر فقیر چند ابھی سیبوں کا ذائقہ نہ بھولا تھا۔ اسی طرح پاروتی بیچاری بیچ میں پھنس گئی تھی کیوں کہ جب بھی پاروتی چنے کی دال کے ساتھ امبل کھانے کی کوشش کرتی تو فقیر چند اسے بیچ میں آ کر ٹوک دیتا اور کہتا ''تو کشمیریوں کی بٹی ہے اور کشمیریوں کے گھر جانا ہے۔'' ایسا ہونا فطری تھا کیوں کہ وہ لوگ اسی ماحول میں پلے بڑھے تھے۔ فقیر چند کی عمر کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے تو کشمیر ہی کی بات کرتے لیکن دیپک اور گوری اپنے دوستوں سے ملتے تو صرف یہاں کی ہی باتیں کرتے۔ شمبھو ناتھ کشمیر جائے نہ یا جائے مگر یہ ضرور یاد رکھتا کہ وہ کشمیر سے آیا ہے۔ فقیر چند ہر صورت میں واپس کشمیر جانا چاہتا تھا لیکن دیپک اور گوری نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ یہی رہنا پسند کر رہے تھے۔ بعد میں ایک ''گھر بساؤ'' کمیٹی بنائی گئی اور انھوں نے مل کر جلوس نکالا اور دوبارہ کشمیر آباد کرنے کے لیے احتجاج کیا۔ اس وقت شمبھو کو اپنی نانی کے الفاظ یاد آئے۔ ''بیج کی بھی اپنی زمین ہوتی ہے۔''

یہ بات بالکل درست ہے کہ بیج کی بھی اپنی زمین ہوتی ہے یعنی کہ اس کا اصل وطن کشمیر ہی ہے۔ جتنا وہ وہاں خوش رہ سکتے ہیں، نشو ونما ہو سکتی ہے کہیں اور نہیں ہو سکتی لیکن بدقسمتی سے ان کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور ابھی تک وہ اپنے اصل وطن یعنی کشمیر واپس نہیں جا پائے۔ اگر چہ حکومت اور دیگر تنظیموں نے کوشش بھی کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اس افسانے میں ہجرت کے ایک ایسے پہلو کو اجاگر کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے یہاں جنریشن گیپ اور تشخص کا مسئلہ آ گیا ہے۔

افسانہ ''سپیرے'' افسانوی مجموعہ ''سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے'' میں شامل ہے، جس میں انھوں نے مہاجرین کے حالات کو بیان کیا ہے۔ تقسیم کے بعد ہجرت جو برصغیر کے عوام کے لیے المیہ ثابت ہوئی اور مہاجرین کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا کسی ذلت سے کم نہ تھا۔ اس افسانے میں آنند لہر نے مہاجروں کے مسائل و پریشانیوں کا جائزہ لیا ہے۔ ''یہ ہمارے ملک کے نہیں ہیں یہ دوسرے ملک کے ہیں، جاسوسی کرتے ہیں، ایک ملک کی خبر دوسرے ملک تک پہنچاتے ہیں'' وغیرہ۔

ایک سپیرے نے ادھر دیکھنے کی کوشش کی تو فوجی نے زور سے کہا ''کیا
کر رہے ہو؟ کیوں دیکھ رہے ہو ادھر؟''

''صاحب باڈر کراس کرنا منع ہے دیکھنا تھوڑے منع ہے؟'' ''تم دیکھ
بھی نہیں سکتے'' (5)

اس افسانے میں آنند لہر نے مختصراً ان تمام حالات کو بیان کیا ہے جن سے لوگوں کو ہجرت کرنی پڑی۔ سرحد قائم ہوئی اور پھر جنگ کی تیاریاں ہوئیں، جن سے ہر کوئی خوف و ہراس میں جیتا ہے۔ لیکن جو لوگ پہلے سے ہی آباد ہوتے ہیں ان کو اپنے ملک کے بارے میں خیال رہتا ہے لیکن مہاجرین جن کا کوئی ملک نہیں ہوتا وہ جہاں بھی رہتے ہیں اسے اپنا ملک سمجھتے ہیں۔ یہ ایک آفاقی سوچ ہے لیکن اس جہاں میں اور خاص طور پر آج کے دور میں مہاجروں کی زندگی کسی المیہ سے کم نہیں۔ بٹوارے کے دوران ایسا بھی ہوا کہ کچھ لوگوں کے رشتہ دار وہیں رہے اور وہ سرحد کے اس پار چلے گئے۔ اس طرح سے وہ ان سے ملنا بھی چاہتے ہیں جو اتنا آسان نہیں رہا۔

''ایک دن سپاہی نے کہا تمہارا ملک کون سا ہے۔ ''زمین''۔ مگر رہتی
کہاں ہو، ''آسمان کے نیچے''۔ (6)

اگر چہ عملی طور پر یہ صحیح نہیں ہے لیکن پھر بھی لوگ مختلف قسم کے مسائل اور ملکوں، ریاستوں کے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ اگر چہ یہ بھی حقیقت ہے لیکن وہ بھی اسی زمین اور آسمان کے درمیان میں ہیں۔ لوگوں نے ہمارے سماج میں یہ سب جو زمین کا، ملکوں، ریاستوں اور قصبوں میں بٹوارہ کیا ہے دراصل یہ ہی ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ مہاجرین پر کئی میٹنگیں اور بحثیں ہوتی رہیں لیکن برسوں تک ان کا کوئی حل نہ نکل سکا اور جس طرح کی زندگی انھیں گزارنی پڑی یہ ایک دکھ بھری کہانی ہے۔ ایک طرف انھیں دوسرے ملک کا شہری کہنا۔ دونوں طرف کے فوجیوں کو یہ سانپ اور سپیرے لگتے ہیں۔ آنند لہر نے اس افسانے میں انھیں استعارے کے طور پر سانپ اور سپیرے کہا ہے یعنی کہ ان کو یہ ڈر رہتا تھا کہ کب کس کو ڈس لے کوئی بھروسہ نہیں لیکن یہ معصوم جن کو ہر طرح کے طعنے سننے پڑتے تھے اور ہر طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے یعنی کہ ایک ملک سے دوسرے ملک اور وہاں ہر چیز کی محرومی۔

ناول ''اگلی عید سے پہلے'' آنند لہر کا ناول جو 95 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں آنند لہر نے نہ صرف ہجرت کے مسائل کو بیان کیا ہے بلکہ وہاں کے بھائی چارے کا بھی بخوبی جائزہ لیا ہے۔ اس طرح اس وقت کے حالات کو بھی فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے:

''آنند لہر کا زیر نظر ناول ''اگلی عید سے پہلے'' سرزمین کشمیر کی ایک درد بھری داستان ہے جو مصنف نے خون دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھی ہیں۔ یہ داستان ہندستان کی آزادی سے آج تک پہنچتی ہے، یعنی کہ 1947 سے 1996ء تک۔ سرزمین کشمیر کی یہ درد بھری روداد، جو نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے ایک ایسی روداد ہے جس میں روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔ کہیں کہیں متصادم بھی ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً کہیں اندھیرا فتحیاب ہوتا ہے اور کہیں روشنی لیکن انجام کار روشنی ہی کامران اور نصرت یاب ہوتی ہے۔ جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نصف صدی کا یہ سارا سفر ناول نگار کے اپنے دل کی تجلی سے جگمگا رہا ہے۔ ناول نگار نہ قنوطی ہے اور نہ رجائی بلکہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ دنیا سعیٔ انسانی کے ذریعے بہتر ہو سکتی ہے یعنی اصلاح کا قائل ہے۔ کاش ہندستان اور پاکستان کے لوگ اس ناول کو پڑھیں اور اس کی روح تک پہنچنے کی کوشش کریں۔''(7)

واقعی یہ ایک دلچسپ ناول ہے۔ ناول کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔ چاروں طرف گولیاں چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ لوگ سہمے ہوئے تھے مگر ایک نعرہ روشنی بن کر اندھیرے کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا، ''زندہ باد، زندہ باد، ہندو مسلم سکھ اتحاد'' یعنی کہ ہر خاص و عوام کی رگ رگ میں یہ نعرہ رچا بسا ہوا تھا۔ ہر کوئی خوش تھا۔ عبدل جو اس ناول کا اہم کردار ہے کلچے بناتا ہے اور ہر کوئی بلا کسی مذہب و ملت کے امتیاز کے اس کے کلچے کھاتا ہے۔ ہر کوئی خوش حال ہے لیکن جب سے پاکستان سے آئے قبائلی کشمیر کے چاروں طرف پھیل گئے جو ہتھیار بند تھے لیکن وہاں کی عوام کے پاس ایک ہی نعرہ تھا ''زندہ باد، زندہ باد، ہندو مسلم سکھ اتحاد''۔ گو کہ کشمیر کے ماحول اور آپسی بھائی چارگی کو دیکھ کر قبائلی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

آنند لہر نے اس ناول میں کشمیری بھائی چارے کی تصویر کشی کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔ قبائلی وہاں کی عوام کو خوف زدہ کرنے کے لیے گولی باری کرتے رہے جس سے وہاں کی عوام گھبرا گئی کیوں کہ کچھ عرصے سے ایسا لگ رہا تھا کہ ان کو اب پرسکون فضا میں گولی بارود کی آوازیں سنائی دینے لگیں لیکن اس کے باوجود بھی وہ ایک

دوسرے کوسہارا دیتے تھے کہ ہمارے ہوتے ہوئے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ گویا وہاں کی ہر چیز سے اتحاد کی آواز آ رہی تھی اور وہاں کے عوام کو اس بات کا یقین بھی تھا۔ ''اتحاد کی لاٹھی، ہائیڈروجن بم سے بھی زیادہ مضبوط ہے''۔ عبدل نے اپنی بات دوہرائی۔ اگرچہ ماضی میں وہاں حالات جیسے بھی رہے ہوں لیکن وہاں کی عوام نے مل کر حالات کا مقابلہ کیا جسے دیکھ قبائلی پریشان تھے۔ ہر کوئی اپنے مذہب کے بتائے اصولوں پر چلتا اور دوسرے کے عقیدے کا احترام بھی کرتا۔ کشمیر میں ہر موسم میں ایک نیا انداز اور دلکش نظارہ ہوتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں اور چاند کی روشنی میں کشمیر کی دلکشی میں چار چاند لگتے ہیں۔ یہاں کے کتے بھی بھونکتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کہاں جانا ہے؟ بھوک تو نہیں لگی؟

وہاں کے کتے رات بھر بھونکتے رہتے ہیں۔ پہرہ دیتے رہتے ہیں تا کہ وہاں کی عوام آرام سے رات کو سو سکیں۔ اس طرح قبائلیوں نے ایک عرصے تک وہاں بدامنی اور دہشت پھیلانے کی کوشش کی لیکن کچھ نہیں کر پائے۔

> ''سورج نکلنے ہی والا تھا کہ بدری نے شنکھ بجا کر اس کا سواگت کیا۔ ہر چیز خاموش ہوگئی۔
>
> ''اسلم'' عبدل نے اپنے بڑے بیٹے کو آواز دی۔
>
> ''بولیے ابا'' اسلم نے جواب دیا۔
>
> ''سنا نہیں بدری شنکھ بجا رہا ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے۔'' سن رہا ہوں ہوں شنکھ ہی نہیں بلکہ بدری چچا نے مندر کے اندر گھنٹیاں بجانی بھی شروع کر دی ہیں۔''
>
> ''اسلم اٹھا اور نماز پڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔''(8)

مصنف نے کشمیری بھائی چارے، وہاں کی صوفی اور رِشی منی کی روایت جسے وہاں کی عوام نے اپنایا اور آگے بڑھایا کو بخوبی پیش کیا ہے۔ قبائلیوں نے ایک ایسا منصوبہ بنایا کہ لوگوں کو مذہب کے نام پر لڑایا جائے۔ گاؤں میں اشتہار پھینکے گئے۔ جن پر لکھا تھا کہ باہر ہندو مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ ان کی سازش وہاں کے تمام لڑکوں کو بھڑکانا تھا تا کہ بدامنی پھیلا سکیں۔ لیکن یہ نہ ہو سکا کیوں کہ بدری نے تمام نوجوانوں کو بلایا اور

ان کو قبائلیوں کی سازش کے بارے میں بتایا۔ اگر چہ کچھ لوگ وہاں ان کے بہکاوے میں آ جاتے لیکن پھر بھی وہاں بدری، عبدل، سلمان جیسے زندہ دل لوگ تھے۔ قبائلیوں کا یہ منصوبہ بھی ناکام ہوا۔ کیوں کہ وہ جان گئے کہ یہ لوگ پوجا اور نماز صرف ادا ہی نہیں کرتے بلکہ اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ اس کے بعد انھیں ایسا لگا کہ جب تک بدری یہاں پر ہے یہ لوگ نماز نہیں چھوڑ سکتے۔ ایک قبائلی وہاں پر آیا اور کیپٹن سے کہنے لگا:

''کیپٹن تمھیں معلوم ہے کہ ہم کیوں کامیاب نہیں ہو سکتے؟ تم ہی بتاؤ
کیپٹن نے جواب دیا۔ ''ایک نعرہ ہمیں کامیاب نہیں ہونے دیتا''۔ وہ
کیا کیپٹن نے پوچھا۔
''وہ نعرہ ہے، زندہ باد زندہ زندہ، ہندو مسلم سکھ اتحاد'' (9)

اس کے بعد قبائلی نے ایک اور طریقہ سوچا کہ بدری کا شنکھ کا چرا لیا جائے۔ ایسا کرنے سے وہ لوگ نہ پوجا کر سکیں گے اور نہ ہی نماز پڑھ سکیں گے۔ اس کے بعد غلام نام کے قبائلی نے اس کا شنکھ چرا لیا لیکن وہ جب ایسا کر رہا تھا تو اس کو گناہ کا بھی احساس ہو رہا تھا بعد میں اس بات کا پتہ بدری کو صبح لگا تو وہ بیہوش ہو گیا اور بعد میں دیگر لوگوں کو بھی خبر ہوئی تو ہر کوئی پریشان ہو گیا۔ گویا کشمیر کی تہذیب کھو گئی۔ اس بات کا احساس عبدل و سلمان اور دیگر لوگوں کو شدت سے تھا اور ہر کوئی اس بارے میں باتیں کرنے لگا اور اسے اپنی ذمہ داری سمجھ کر حاصل کرنے کی ترکیب سوچنے لگے۔ دیگر کردار اور بھی جو اس وقت کے سیاسی حالات پر باتیں کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ سلمان کو گولی مار دی گئی ہے۔ ہر کوئی وہاں آ گیا۔ سلمان جو باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اور اسے بدری کے باپ نے اپنے بیٹے کی طرح پالا تھا اور ایک سچا مسلمان بننے کی تعلیم دی تھی۔ اسی طرح وہاں لوگ مذہب سے اٹھ کر انسانیت کو بڑا سمجھتے تھے۔ ایک دوسرے کی مدد اور عزت کرتے تھے۔ اس کے بعد قبائلیوں کو وہاں سے بھگایا گیا اور بعد میں لوگ اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئے اور ترقی و تعمیر کے کام ہونے لگے۔ اچانک ایک دن ایسی آواز آئی کہ عبدل نیند سے جاگا اور وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور پوچھنے لگا کہ یہ آواز کہاں سے آئی۔ کچھ لوگوں سے پوچھا تو اس سے بتایا کہ یہاں بڑے بڑے دھماکے ہو رہے ہیں۔ چاروں طرف گولیاں چل رہی ہیں اور ہر طرف دہشت کا ماحول چھا گیا ہے۔ ایک نوجوان نے بتایا کہ تمھیں معلوم نہیں کہ ہم لوگ آزادی کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اسی دوران وہاں اور کچھ لوگوں کی

جھڑپ ہوئی جس کے نتیجے میں ایک عورت کو گولی لگی اور مر گئی۔عبدل نے محسوس کیا کہ یہ عورت نہیں بلکہ کشمیر کی تہذیب کی لاش ہے۔اس کو عبدل نے اٹھایا اور ڈسپنری کی طرف لے گیا جس پر قبائلیوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ایک پٹھان جو لڑکی کا پیچھا کر رہا تھا اس وقت عبدل کو بدری اور سلمان یاد آئے اور وہ بدری کے گھر کی طرف بھاگا۔اس نے سنا کہ بدری یہاں سے بھاگ گیا ہے۔عبدل کو اس بات سے تعجب ہوا اور سلمان کے گھر آیا۔اس کا ایک لڑکا اور دوسرا دہشت گردوں کے ساتھ چلا گیا تھا۔اس کے بعد عبدل سرحد کے اس پر گیا جہاں کشمیری نوجوانوں کو لے کر انھیں ہتھیاروں کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔جب وہاں کے حالات دیکھے تو وہاں بھی دہشت اور چاروں طرف خوف کا ماحول تھا۔وہاں بھی جو لوگ کشمیر سے بھاگ کر آئے، ٹینٹوں میں رہتے تھے۔اس کے بعد عبدل نے دیکھا کہ کشمیری لڑکوں کے ساتھ وہاں ظلم و جبر ہو رہا تھا۔عبدل کی ملاقات وہاں فوج کے کمانڈر سے ہوئی۔اس نے کہا کہ واپس چلے جاؤ لیکن باڈر سیل ہے۔وہاں پر فوج تعینات ہے۔کمانڈر نے کہا کہ ہے کہ باڈر فوج سے سیل نہ ہوا تھا بلکہ ایک نعرے سے تھا جسے ہم نے ختم کر دیا ہے۔عبدل کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ان بچوں کو اسکول میں ہونا چاہیے تھا اور وہاں ریاضی، سائنس، فلسفہ پڑھنے چاہیے تھے۔اس کے علاوہ وہاں کئی اور کشمیری نوجوان بھی تھے جو بھاگنے کے لیے سرنگ بنا رہے تھے لیکن پکڑے گئے۔ عبدل وہاں سے کشمیر واپس آیا اور اس دوران موت کی کئی خبریں آنے لگیں۔ایک لڑکا جس کی ٹانگ میں گولی لگی ہے عبدل نے اس نے نام پوچھا۔اس نے کہا اب میرا کوئی نام نہیں ہے کیوں کہ کوئی انھیں ملی ٹنٹ اور کوئی مجاہد کہہ رہا تھا۔بس کشمیری ہر طرف سے پٹ رہا تھا۔اس کے بعد عبدل اپنے گاؤں چلا آیا لیکن اس نے کھانا پینا سب چھوڑ دیا۔جب لوگوں نے وجہ پوچھی تو اس نے وہی نعرہ دہرایا۔اتحاد کا نعرہ لگانے کے بعد لوگوں کے اندر حوصلہ پیدا ہوا اور ہر کوئی اپنی پریشانیاں ایک دوسرے سے بانٹنے لگا اور حالات پر اظہار خیال کرنے لگا۔عبدل نے دوبارہ ان لوگوں سے بدری کے بارے میں پوچھا جہاں ہر کسی کی اپنی اپنی رائیں تھیں۔عبدل نے فیصلہ کیا کہ وہ جموں جا کر بدری کو دیکھے گا۔اس وقت چاروں طرف شک وشبہ کا ماحول تھا۔کوئی بھی کسی پر بھروسہ نہیں کر رہا تھا۔عبدل کسی طرح جموں آیا اور ان کے ٹینٹ میں پہنچا جہاں وہ خستہ حالت میں رہ رہا تھا اور وہاں ان کو پوچھنے والا کوئی نہ تھا۔عبدل بدری کے پاس پہنچا اور اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ بدری نے پوچھا کون ہو تم؟

عبدل نے بتایا کہ میں تمہارا پڑوسی ہوں۔اس کے بعد بدری نے اپنے حالات عبدل کو بتائے۔اس کی بیوی اسپتال میں داخل تھی اور بچی فیکٹری میں کام کر رہی تھی۔ جب وہ دونوں ہسپتال گئے تو دیکھا کہ وہ مری پڑی تھی اور کئی لوگ وہاں سن اسٹروک اور سانپ کے کاٹنے کی وجہ سے مر گئے تھے۔ بدری نے وہاں کے حالات دیکھ کر دوبارہ کشمیر واپس چلا گیا۔کشمیر میں چاروں طرف ہڑتال تھی، چاروں طرف خاموشی تھی، بارش ہو رہی تھی، لوگ پریشان تھے کیوں کہ تین دن بعد عید بھی تھی۔عبدل کو اس وقت بدری کے باپ کی یاد آئی ایسے حالات میں جب وہ بتاتا تھا کہ عید کب ہوگی؟ اس کے بعد وہاں عبدل کے پاس کئی اور لوگ بھی آئے اور ایک دوسرے گفتگو کرنے لگے۔ بدری نے ان لوگوں سے کہا ''آؤ بدری کو لے کے آئیں کیوں کہ اس کے بغیر عید کی خوشیاں ہم منا نہیں سکتے۔'' اس کے بعد لوگ بھی بات کرنے لگے کہ ہم نے بدری کو روکا کیوں نہیں۔ہم بدری کے بغیر مکمل نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارے آباواجداد تھے۔آخر میں عبدل نے بلند آواز میں کہا کہ آؤ بدری کو لے کر آئیں۔لوگوں نے بلند آواز میں جواب دیا وہ بھی اگلی عید سے پہلے۔

بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں آنند لہر نے اس ناول کے ذریعے نہ صرف اس حادثے کو موضوع بنایا ہے بلکہ کشمیر کی روایت اور بھائی چارے کی دلکشی کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔اس کے علاوہ اس وقت کشمیر کی عوام جن حالات سے دوچار تھی ان حالات کو بھی آنند لہر نے بخوبی پیش کیا ہے اور جن حالات میں کشمیری پنڈتوں کو ہجرت کر کے وہاں سے بھاگ کر باہر آباد ہونا پڑا آنند لہر نے اس کی بھی بھرپور عکاسی کی ہے اور صدیوں کی کشمیری رواداری، بھائی چارگی اور ہندو مسلم میں اخوت ومحبت کی جو شاندار روایت تھی آنند لہر نے بخوبی پیش کیا۔حالانکہ عملی طور پر حالات بدل چکے تھے اور اس طرح عملی کوشش کوئی بھی نہ ہوئی۔لیکن پھر بھی آنند لہر نے ایسے موضوع کا انتخاب کر کے ایک امید ظاہر کی کہ ''اگلی عید سے پہلے'' ان کو اپنے اصل وطن میں بلا لیا جائے۔

☆☆☆

حواشی:

(1) 1951, Convention relating to the Status of Refugee

(2) خان شاہد وہاب، اردو فکشن میں ہجرت، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005، ص:30

(3) خدیجہ مستور، آنگن، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1996، ص:293

(4) آنند لہر، کورٹ مارشل، جموں: مانوی پرکاشن، 2006، ص:82

(5) آنند لہر، سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2015، ص:32

(6) ایضاً، ص:34

(7) آنند لہر، اگلی عید سے پہلے، جموں: مانوی پرکاشن، پنج تیرتھی، 2004، ص:6-1

(8) ایضاً، ص:12

(9) ایضاً۔ص:16

(ب)

آنند لہر کے فکشن میں سرحد

دیگر موضوعات کی طرح سرحد بھی اردو فکشن کا اہم موضوع رہا ہے۔ مختلف فکشن نگاروں نے اس موضوع پر اپنی تخلیقات پیش کی ہیں۔ جہاں تک آنند لہر کے فکشن میں سرحد کا تعلق ہے تو انھوں نے سرحد سے پیدا شدہ مختلف مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ آنند لہر کے افسانے ''کورٹ مارشل''، ''اگر ایسا ہوتا''، ''انسان کب جیتے گا''، ''بٹوارہ''، ''یہ سرحدیں''، ''وہ کدھر جائے''، ''سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے''، ''ہتھیار''، ''انوکھی دعا'' اور ''سرحد کے اس پار'' میں سرحد کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح اس کے ناول ''سرحدوں کے بیچ'' میں سرحد سے متعلق عوامی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

''کورٹ مارشل'' آنند لہر کا یہ افسانہ افسانوی مجموعے ''کورٹ مارشل'' میں شامل ہے۔ مصنف نے اسی افسانے مجموعے کا نام رکھا ہے۔ ''کورٹ مارشل'' ایک مختصر سی کہانی ہے جس میں ایک فوجی آفیسر پر الزام تھا کہ اس نے دشمن ملک کی فوج کی مدد کی لیکن اس سے پہلے اس نے اپنے ملک کے حق میں جب لڑائی کی تھی تو اسے انعامات سے نوازا گیا تھا۔ سیلاب کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان سرحد کا پتہ نہ چلا اور دونوں طرف کی عوام مصیبت میں تھی لیکن فوجی ان کی مدد کر رہے تھے۔ اس وقت کوئی بھی جنگ کے بارے میں سوچ نہیں رہا تھا۔ ہر کوئی عوام کو بچانے میں لگا تھا اور بعد میں جب حالات ٹھیک ہوئے تو فوج کے کچھ لوگ وہاں پر آئے اور ایک فوجی افسر سے کہنے لگے کہ تم نے دشمن فوج کی مدد کی ہے اور اس پر فوجی عدالت میں کاروائی ہوئی اور عدالت میں اس سے وجہ پوچھی گئی کہ تو اس نے جواب دیا:

''ہر طرف ایک ہی طرح کے درخت تھے اور پانی کا رنگ بھی دونوں
ملکوں میں ایک جیسا تھا۔ چڑیوں کے چہچہانے کا طریقہ بھی ایک جیسا
تھا۔ جب سیلاب آیا تو دونوں کے لوگ ایک ہی طریقے سے چیخے۔ ان
کے گھر بھی ایک ہی طریقے سے بہے تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ دھرتی کا
کون سا حصہ کس ملک کا ہے۔''

''مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ہم تو لڑنے کے لیے لڑتے ہیں، زمین تو بس
زمین ہے، نہ تو اس کا کوئی ملک ہے اور نہ کوئی مذہب۔''(1)

اس مختصر افسانے میں آنند لہر نے سرحد کے مسائل یعنی تقسیم کے نتیجے میں دونوں ملکوں کو الگ کرنے کے لیے کھینچی گئی اس کو موضوع بنایا ہے اور بتایا ہے کہ قدرتی آفات کے ذریعے انسان کی بنائی ہوئی سرحد مٹ گئی۔ لوگ اور فوجی ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ انھیں لگا کہ وہ ایک ہی ملک کے باشندے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرنے لگے۔ لیکن بعد میں جب ان کو پہچان ہوئی تو پھر ان کی دوبارہ جنگ ہو گئی۔ اس طرح پھر سے دوبارہ سرحدیں قائم ہوئیں اور پھر سے مسائل شروع ہو گئے حالانکہ لوگ سمجھ چکے تھے کہ وہ مذہب کے نام پر ایک دوسرے سے لڑتے ہیں اور مذہب کی بنیاد پر ایک ملک کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ سب مسائل درپیش ہیں اور عوام جس کا شکار ہو رہی ہے۔ آنند لہر کے یہاں اکثر آفاقی نظریہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ ہر انسان ایک ہی طرح سے دیکھتا ہے اور دیگر قدرتی مناظر کو محسوس کرتا ہے لیکن پھر بھی لوگ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔

افسانہ ''اگر ایسا ہوتا'' آنند لہر کے مجموعے ''کورٹ مارشل'' میں شامل ہے۔ کچھ افسانے میں انسانی کرداروں کے علاوہ پرندے بھی ہیں جن کے ذریعے آنند لہر نے اپنی بات رکھی ہے۔ وہاں ایک آدمی ہر کسی سے کہتا ہے کہ مجھ سے میرا خواب پوچھو لیکن اس کو کوئی نہیں سنتا۔ اس کا خواب کیا ہے وہ پہلے کسی کو نہیں بتاتا۔ اس کہانی میں آنند لہر نے کشمیر کی ایسی کہانی بیان کی ہے اور اس کے ساتھ تاریخی واقعے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

''ہم اتنی دور سے اس لیے آئے تھے کیوں کہ یہ کسی رِشی کی بسائی ہوئی
زمین ہے اور یہاں کی بہار جنت کی سی ہے۔ ڈل جسے خود آسمان نے

جنت سے کوئی نہر نکال کر زمین پر بھیج دی ہو مگر اس وقت تو چاروں طرف
لاشیں ہی لاشیں اور صحرا جیسے گلشن کے اجڑنے کا ماتم کر رہا ہے۔''
''مجھے اب معلوم ہو گیا ہے۔ اب برف کبھی نہیں آئے گی۔''(2)

اسی طرح مصنف نے استعارانی انداز میں کشمیر کے ماضی اور حال کے حالات کو بیان کیا ہے کہ پہلے وہاں چاروں طرف رونق تھی لیکن اب گولا باری ہو رہی ہے۔ کوئی بھی مکمل نہیں رہا۔ ان حالات میں انسان تو کیا جانوروں کی حالت بھی خستہ ہے۔ ڈل جھیل پر جہاں بے شمار خوبصورت شکارے چلتے تھے اب سب کچھ ختم ہو گیا۔

''اب کے بعد اگر کوئی انسانی نسل پیدا ہوئی تو اتنا ضرور پوچھے گی کہ یہ
سیب کیسے ہوتے ہیں۔ ناشپاتیاں کیسی ہوتی ہیں۔ آنے والی نسل آئے
گی اور کھوجے گی کہ وہ ہاتھ کیسے تھے جو کیسر لگایا کرتے تھے۔''(3)

آنند لہر نے یہاں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر انسان اپنی سوچ اور ان حالات کو بہتر نہیں کرے گا تو ایسا وقت بھی آئے گا جب آنے والی نسل وہاں کی دلکشی، خوبصورتی کو ایک حقیقت نہیں بلکہ خواب تصور کرے گی۔ اگر سرحد کے جھگڑے ختم نہ ہوئے تو یہ بات سچ ثابت ہو سکتی ہے۔ موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے آنند لہر نے نہایت ہی مؤثر انداز میں افسانہ کی تخلیق کی ہے کیوں کہ ہمارا ملک اور بالخصوص ریاست جموں وکشمیر میں حالات ناساز ہیں اور آج سے نہیں ایک عرصے سے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اس طرح کشمیر کی کشمیریت ختم ہو جائے گی اور ریاست میں دہشت گردی کو بڑھاوا ملنے سے پورے ملک کے ساتھ خاص طور سے ریاست کی عوام کی حالت خستہ ہو جائے گی۔

افسانہ ''انسان کب جیتے گا'' افسانوی مجموعے ''کورٹ مارشل'' میں شامل ہے۔ اس افسانے میں آنند لہر نے سرحد کے دو ایسے کرداروں کو موضوع بنایا ہے جو پہلے ایک دوسرے کے پڑوسی تھے اور خوشحالی سے رہتے تھے لیکن سرحد قائم ہونے کے بعد وہ دو الگ ملکوں کے شہری بن گئے:

''ایک دن کرنل گلاب نے گلولوہار سے پوچھا، ''جب یہ سرحد نہیں تھی تو
کیسا لگتا تھا؟''
''بڑا مزا تھا صاحب، گھومو، ناچو، گاؤ'' گلولوہار نے جواب دیا۔

''تمھیں کوئی فائدہ ہوااس کا؟''

''صاحب مجھے دھنے نائی اور بانکے کسان کونقصان ہوا ہے۔صاحب اورتو اورانسانی رشتے بھی ٹوٹ گئے ہیں۔اب پاروالا ڈاکٹر ادھار نہیں کرتا۔ گلولوہار کی بیوی پارو نے آتے ہی کہا''دیکھئے نہ صاحب ادھار کے بغیر کام نہیں چلتا اوراب کوئی ادھار دیتا لیتا نہیں۔کیوں کہ بیچ میں سرحد ہے۔سرحدانسانوں کو بے ایمان بنادیتی ہے۔''

''کسی کواس سرحد کا فائدہ ہوا ہے؟''

''صاحب صرف ہتھیار بنانے والوں کو ہوا ہے یا اسمگلنگ کرنے والوں کو۔عام آدمی کواس کا بہت نقصان ہوا ہے۔''(4)

اس افسانے میں جس طرح سے سرحد کی اوروہاں کے لوگوں کی آنندلہر نے جس طرح منظرکشی کی ہے واقعی حقیقت پرمبنی ہے۔جب ہم افسانہ پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم افسانہ پڑھ نہ رہے ہوں بلکہ یہ منظر دیکھ رہے ہوں۔آنندلہر نے حقائق کی نہایت ہی دلکشی اورسادہ بیانی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اگرچہ یہ ایک مختصرافسانہ ہےلیکن افسانہ نگار نے اس میں اپنی فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔موجودہ حالات کے ساتھ ساتھ ماضی کے حالات کوبھی پیش کیا ہےاوراس کے بعد بیبا کی کے ساتھ سرحد کے مسائل اوراس کے حالات کی منظرکشی کی ہے۔سرحد سے پہلے وہاں کے لوگ بڑی خوشحالی میں اپنی زندگی گزارتے تھےلیکن جب سے سرحد قائم ہوئی وہاں کے لوگوں کو بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس کے علاوہ حدتو یہ ہے کہ وہاں کے لوگ جو ایک دوسرے کے بھروسے جیتے تھے اب ایک دوسرے پربھروسہ نہیں کرتے کیوں کہ ان دونوں کے درمیان سرحد حائل ہے۔سرحد کا عام انسان کو فائدہ کچھ بھی نہیں ہوا بلکہ ہرطرح سے نقصان ہی نقصان ہوا ہے۔سرحد کا فائدہ صرف سیاست دانوں اوراسمگلنگ کرنے اور مذہبی ٹھیکیداروں کو ہوا ہےلیکن عوام تو اس کا شکار ہے۔ایک طرف اپنے ملک کی سیاست سےاوردوسری طرف دوسرے ملک کی گولی باری اس طرح وہاں کی عوام کی زندگی درہم برہم ہوگئی ہے۔بے گناہوں کوگولیوں اورموت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

''ایک سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔درخت کے نیچےصوبیدار نے اس کے

بازو پر چیونٹی گرادی، گولی چلی۔ پھر حولدار اس تاک میں تھا۔ گولیوں کی
بوچھاڑ ہوئی۔ دونوں طرف کے لوگ مرے۔ کئی دن تک گولیاں چلیں۔
پھر ایک دن سیز فائز ہو گیا۔ تمام بڑے آفیسر آئے اور منصوبے بنائے
گئے کہ ایسا طریقۂ کار بنایا جائے کہ دوبارہ ایسا کچھ نہ ہو۔''(5)

آنند لہر نے نہایت ہی سادگی اور سچائی کے ساتھ منظر کشی کی ہے۔ گولہ باری کہاں سے شروع ہو وہاں اس بات کا کوئی بھروسہ نہیں رہتا۔ معصوم عوام تو اپنی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے میں مصروف رہتی ہے لیکن سرحد پر تناؤ کی وجہ سے انھیں بنیادی ضروریات بھی پوری کرنے میں پریشانی ہوتی ہے۔ ان کو مال و جان کا نقصان ہوتا ہے۔ گو کہ وہ اپنی زندگی خوف و ہراس کے سائے میں گزارتے ہیں۔ کہیں سے بھی کوئی آواز آئے تو گولی باری شروع ہو جاتی ہے جس میں فوجیوں کے علاوہ دونوں طرف کے عام انسان بھی نشانہ بنتے ہیں اور بعد میں دونوں طرف سے معاہدہ ہوتا ہے لیکن بعد میں پھر یہی عمل دوہرایا جاتا ہے۔ آج تک نہ جانے کتنے معاہدے ہوئے لیکن ان کے باوجود بھی حالات جوں کا توں ہے۔ اس کے علاوہ افسانے میں ایک فوجی جورانی کو حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے باپ نے منع کر دیا کیوں کہ رانی راجا سے محبت کرتی تھی اور اسی سے شادی کرنا چاہتی تھی اگر چہ وہ سرحد کے دوسری طرف تھا۔ صوبیدار نے دیگر افسروں کے ساتھ فائرنگ بند کرنے کے بہانے سرحد میں تبدیلی کرتا ہے جس کی وجہ سے راجا اور رانی گھر سرحد کے دونوں طرف کر دیا جاتا ہے یعنی راجا کا گھر ایک طرف اور رانی کا گھر دوسری جانب۔ صوبیدار نے کہا:

''میں نے کہا تھا کہ رانی کی شادی مجھ سے کرو کیوں کہ جیت ہمیشہ سرحد
کی ہوتی ہے۔''
رانی کا باپ چپ رہا اور یہ سوچنے لگا کہ ہر بار سرحد جیتتی ہے۔ باردو
جیتتا ہے مگر انسان کب جیتے گا۔''(6)

یعنی کہ کچھ لوگ اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ جس سے انسان سے اور عوام کا خیال نہیں رکھتے۔ سیاست دان تو عوام کی خدمت کا دعویٰ کر کے کرسی حاصل کر لیتے ہیں اور بعد میں اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔ نا ہی عوام کی فکر اور نہ ہی ملک کا خیال رکھتے ہیں۔ مصنف نے اس

افسانے کا نام ''انسان کب جیتے گا'' مناسب رکھا ہے کیوں کہ عام انسان اور اس کے حالات و جذبات کا کوئی خیال نہیں رکھتا اور سرحد کی بنا پر کچھ لوگ اپنا مقصد ہی پورا کرتے ہیں۔ عوام کو سرحد کا فائدہ کبھی نہیں ہوا۔

افسانہ ''بٹوارہ'' آنند لہر کے افسانوی مجموعے ''بٹوارہ'' میں شامل ہے۔ یہ افسانہ تقسیم ملک کے بعد سرحد کے موضوع پر مبنی ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے سرحد کو موضوع اس کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس افسانے میں ایک گاؤں کو دکھایا گیا ہے جہاں لوگ امن وسکون سے رہتے ہیں لیکن چھوٹی سی بات پر وہاں ایک جھگڑا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہاں کے سرپنچ اور پنچ اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ساتھ لوگوں کو بھڑکاتے رہتے ہیں اور نوبت یہاں تک آجاتی ہے کہ گاؤں کو دو حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ اس افسانے میں کچھ ایسے کردار ہیں جو کافی اہم ہیں۔ بعد میں وہاں حالات جب اس طرح ہو جاتے ہیں تو سرحد قائم کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہاں کے لوگ تو کیا جانور بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جا سکتے۔ راج دین کا بیٹا سخت بیمار ہو گیا۔ اس نے کہا کہ فقیر چند سے کہو کہ بیٹے کو دست لگے ہیں۔ فقیر چند نے دوائی تیار کی لیکن دوائی وہاں کیسے پہنچائی جائے اگرچہ ان کا گھر چند گز فاصلے پر تھا لیکن وہاں جانے کے لیے اجازت نامہ ضروری تھا لیکن انھوں نے وقتی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دونوں طرف کے سپاہیوں سے بات کی اور دوائی لائی گئی۔ اس افسانے میں ایک ایسا کردار ہے وہ جب ایسے حالات دیکھتا ہے تو زور سے ہنستا ہے۔ کوئی اگر اس سے پوچھتا ہے تو وہ بتاتا ہے کہ

> ''یہ راج دین اس وقت بٹوارے کے حق میں نعرے لگا رہا تھا۔ اس وقت اسے معلوم نہ تھا کہ اس کے بیٹے کو بیمار ہونا ہے اور فقیر چند کی دوائی کی ضروری ہے۔''(7)

بعد میں اس طرح انھیں ایک دوسرے کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بعد میں اُگروا د شروع ہوا۔ سرحد مضبوط ہو گئی۔ جانور ایک جگہ جمع ہوئے گویا یہ کہہ رہے ہوں کہ اگر انسان نے تقسیم بند نہ کی تو ہم دودھ نہ دیں گے۔ آنند لہر نے استعاراتی انداز میں جانور کی زبانی انسانوں پر طنز کیا ہے۔ جانور بھی اس افسانے کے کردار ہیں اور انسانی افعال پر طنز کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ جانور ہو کر بھی یکساں ہیں لیکن انسان انسان ہو کر بھی حیوانوں سے بدتر حرکتیں کر رہا ہے۔ اپنی خودغرضی کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے حالاں

کہ جانور ایسا کبھی نہیں کرتا۔آنند لہر نے انسان کے دو رخوں کو پیش کیا ہے۔ جب وہ مجبور ہوتا ہے تو اسے انسانیت کے تمام درس یاد ہوتے ہیں تو جب وہ خوش حال ہوتا ہے تو سب کچھ بھول جاتا ہے۔اس کے علاوہ وہ لوگ جو سماج میں ذمہ دار ہوتے ہیں، وہ بھی سماج میں ابتری پھیلاتے ہیں۔معصوم لوگوں کو بھڑکاتے ہیں اور اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ انسانیت کا انھیں پاس ولحاظ نہیں رہتا۔نقصان ہمیشہ عام لوگوں کا ہی ہوتا ہے۔لوگ جو ایک جگہ رہتے ہیں چاہے وہ کسی بھی قوم یا مذہبی عقیدے کو مانتے ہوں انھیں ایک دوسرے کی ضرورت پڑتی ہے اور ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ یہ انسانیت کا پہلا درس ہے لیکن اکثر ایسا دیکھنے کو کم ملتا ہے اور کہیں ہوتا بھی ہے تو وہاں کے نمائندہ افراد ایسا ہونے نہیں دیتے۔اس افسانے میں آنند لہر نے فنکاری کے علاوہ گہرے مشاہدے کا بھی ثبوت دیا ہے اور یہ واقعی ایک دلچسپ افسانہ ہے۔سرحد ہمارے سماج میں ایک بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ کیوں کہ دونوں ملکوں کا ایک دوسرے کے تئیں تعصّبانہ رویہ اور سرحد کے دوسری طرف سے دہشت گردی اتنا ہی نہیں بلکہ دوسری کئی چیزوں یعنی منشیات اور جعلی نوٹوں کو بھی سرحد کے اس پار سے لایا جاتا ہے۔اس طرح کئی اور چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ملک اور سماج میں ابتری پھیلی ہوئی ہے۔

افسانہ ''یہ سرحدیں'' آنند لہر کے افسانوی مجموعے ''بٹوارہ'' میں شامل ہے جس میں سرحد اور عورت کو موضوع بنایا گیا ہے۔سرحد کی وجہ سے عورتوں کا استحصال کس طرح ہوتا ہے۔اس افسانے میں ایک سپاہی کا کردار ہے جو سرحد پر اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔وہ اپنے مذہب کا پیروکار ہونے کے ساتھ دوسرے مذاہب کی بھی عزت کرتا ہے اور اچھے برے کاموں کے نتائج سے بھی بخوبی واقف ہے۔اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ سچ کا ہی ساتھ دے گا۔ وطن کی حفاظت، سرحد کی حفاظت اور عورت کی حفاظت ان کی زندگی کے اہم مقاصد میں شامل ہے۔ایک دن اسے ایک عورت کے چیخنے کی آواز سنائی دی اور وہ اس جانب بھاگا۔اس نے نہ سرحد کی پرواہ کی کیوں کہ وہ جان گیا تھا کہ کہیں نہ کہیں عورت کا جنسی استحصال ہو رہا ہے۔اس وقت اسے سرحد کے فاصلے بے بنیاد نظر آئے اور سرحد کے اس پار چلا گیا اور اس عورت کی عزت کو بچالیا۔ یہ کام کر کے اسے خوشی ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس ملک کے سپاہیوں نے اسے گھیر لیا اور وہ قید کر لیا گیا۔اس نے ایک سپاہی سے پوچھا کہ اس کا جرم کیا ہے تو اس نے بتایا گیا کہ تم نے سرحد پار کی ہے۔

''مگر میں نے ایسا ایک عورت کی عزت بچانے کے لیے کیا ہے۔''

''مگر وہ تو دوسرے ملک کی ہے؟''

اس نے کہا کہ ''ہر مذہب میں عورت کی عزت بچانے کی بات کہی گئی ہے۔ایک یا دوسرے ملک کی عزت بچانے کی نہیں۔''(8)

لیکن اس کی کوئی بات نہیں سنی گئی اور اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔آخر ایک دن فوجی عدالت میں اسے پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ تم نے جرم کیا ہے۔اس نے جواب دیا کہ میں نے ایک عورت کی عزت بچا کر ایک اچھا کام کیا ہے۔مگر تم نے سرحد پار کی ہے؟ اس نے کہا کہ عورت کی عزت بچانا بھگوان کا حکم ہے اور سرحد کی حفاظت کرنا انسان کا حکم۔عورت کسی بھی ملک کی ہو اس کو تکلیف میں یکساں درد ہوتا ہے۔آخر میں آنند لہر نے سپاہی کی زبانی ایک آفاقی پیغام دیا ہے وہ یہ کہ جب تک سرحدیں قائم رہیں گی تب تک انسانی رشتوں کی موت ہوتی رہے گی۔لہٰذا جنگ انسانوں کے خلاف نہیں سرحدوں کے خلاف ہونی چاہیے اور لڑائی ملکوں کو بچانے کے لیے نہیں بلکہ عورت کی عزت کو بچانے کے لیے ہونی چاہیے۔

افسانہ ''ہتھیار'' آنند لہر نے اس افسانے میں ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو سرحد پر جا کر ہتھیاروں کی ٹریننگ لیتے ہیں اور پھر اپنے ملک میں آ کر دہشت گردی کرتے ہیں۔جو لوگ پہلے ایسا پہلے کر چکے تھے وہ اس کے نتائج کے بارے میں جانتے تھے۔اس لیے وہ دوسروں کو سمجھاتے:

''جانے سے پہلے اتنا یاد رکھو کہ جب گولی چلتی ہے تو انسان زخمی ہو جاتا ہے چاہے اس کا کوئی بھی ملک ہو، کوئی بھی مذہب ہو۔''(9)

اس افسانے کا نچوڑ یہ ہے کہ کسی بھی چیز کا کوئی ملک نہیں ہے۔دنیا کی ہر چیز میں اپنی خصوصیت ہے اور وہ قدرتی طور پر آزاد ہے تو کیوں کر سرحد بنائی جاتی ہے۔کہیں زبانوں کے جھگڑے ہیں تو کہیں اور چیزوں کو لے کر لوگ الجھے ہوئے ہیں۔اس سے بہتر ہوتا کہ ہسپتال اور دیگر چیزیں بنائی جاتیں جو انسان کی ضروریات ہیں۔کسی بھی انسان کو دوسرے پر بھروسہ نہیں رہا کیوں کہ وہ انسانیت پر نہیں ہتھیار پر بھروسہ کرتا ہے۔بعد میں ان لوگوں کو احساس ہوتا ہے کہ ان ہتھیاروں کا کیا جائے۔اگر ایسا ہی رہا تو آنے والی نسل بھی یہی کام کرے گی۔بہتر یہ ہوگا کہ ہتھیاروں کی جگہ انھیں پھول اگانے کے طریقے بتائیں۔اس لیے ہتھیاروں کو ایسے ہی چھوڑ

دیا جائے اور وقت بارود کو ضائع کر دے گا۔ یہ تمام مسائل جو آج ہمارے سماج میں موجود ہیں اس کے صرف اور صرف ہم لوگ ہی ذمہ دار ہیں۔

افسانہ ''سرحد کے اس پار'' آنند لہر کا دلچسپ افسانہ ہے جس میں آنند لہر نے سرحد پر رہنے والے لوگوں کو موضوع بنایا ہے اور ان کی زندگی کے دیگر مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ اس افسانے میں دو کردار ہیں جو سرحد کے دونوں طرف رہتے ہیں۔ اس کے پہلے ان کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ایک دن دونوں ملے اور کہنے لگے:

''کس کس سرحد کو پار کرے کوئی! فرقوں کی سرحد، قوموں کی سرحد، لوگ
ان سرحدوں کو مٹا کیوں نہیں دیتے؟''(10)

اس کے بعد روشن کو گوپی کی ماں کے بارے میں جانکاری ملتی ہے کہ اسے کینسر ہے تو وہ سرحد پار کر کے اس طرف جاتا ہے اور ان کی خبر لیتا ہے لیکن وہاں کے فوجی اسے قید کر لیتے ہیں اور اس سے سوالات پوچھتی ہے۔ وہ نڈر ہو کر بولتا ہے:

''جب دونوں ملکوں کے لیڈر ملتے ہیں، فوجی ملتے ہیں، چور ملتے ہیں،
اسمگلر ملتے ہیں، جج ملتے ہیں، کھلاڑی ملتے ہیں تو عام لوگ کیوں نہیں
ملتے؟''(11)

واقعی یہ ایک حقیقت ہے کہ دونوں ملکوں کے سیاستدان، فوجی، چور، اسمگلر، جج، کھلاڑی وغیرہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ سیاستداں سیاست کرتے رہتے ہیں، فوجی بھی میٹنگیں کرتے رہتے ہیں، چور اور اسمگلر مل کر دھندہ کرتے رہتے ہیں لیکن پابندی صرف عام انسانوں پر ہے جو ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔

ناول ''سرحدوں کے بیچ'' آنند لہر کے ایک دلچسپ ہے جس میں انھوں نے کشمیر کے ایک ایسے گاؤں کو موضوع بنایا ہے جہاں کے لوگ اپنے عادات و اطوار کے مطابق جیتے ہیں اور اپنی روزمرہ کی زندگی گزارتے ہیں۔ رانی کے گھر میں اس کا باپ اور وہ رہتی ہے۔ رانی کا باپ پہلے کے حالات سے واقف تھا جب چاروں طرف خوشحالی تھی۔ ہر کوئی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھا لیکن بعد میں حالات میں تبدیلی آئی۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ آخری گاؤں ہوتا۔ وہاں پاس میں ہی پودینہ کی کاشت ہوتی ہے جس کی چٹنی بنا کر لوگ

کھاتے ہیں۔ناول کا اقتباس یوں ہے:

''ملک بٹا، سرحدیں قائم کردی گئیں، مگر لکیروں کا کھیل کھیلنے والے بڑے لوگ اس بات کو نہ جانتے تھے کہ اس گاؤں کے لوگ پودینہ کی چٹنی کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کیوں کہ انھوں نے نہ یہ گاؤں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی یہاں کے لوگوں کو ہنستے کھیلتے دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس گاؤں کے لوگوں کو پودینہ پسند تھا اور وہ زمین جہاں پر وہ اگتا تھا ان کے لیے خاص اہمیت رکھتی تھی۔''(12)

رانی کا باپ ہر روز جنگل سے پودینہ لاتا تھا اور اس کی چٹنی سے روٹی بڑے مزے سے کھاتا تھا۔ایک دن اس کو پیٹ میں درد ہو جاتا ہے اور رانی پودینہ لانے جاتی ہے اور اسی دوران سرحد کے اس پار چلی جاتی ہے جہاں اسے جاسوسی کے جرم میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور اس پر سختی کی جاتی ہے۔ راجا نام کا ایک انسپکٹر وہاں پر موجود ہے جو اس کی نگرانی کرتا ہے۔اسی دوران وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں اور بعد میں اس بات کی خبر وہاں ہو جاتی ہے تو راجا کو دوسری جگہ بھیج دیا جاتا ہے۔ راجا نوکری چھوڑ کر دوسری نوکری اختیار کر لیتا ہے اور رانی سے ملنے آتا ہے۔اس کے بعد وہ ایک دوسرے ملتے رہتے ہیں۔ایک دن رانی کو اچانک چکر آتی ہے۔ ڈاکٹر نے رانی کی جانچ کر کے بتایا وہ حاملہ ہے۔ رانی نے بے جھجک ہو کر یہ بات سب کو بتائی کہ راجا اس کے بچے کا باپ ہے۔اس کے بعد جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی سزا معاف کر دی جاتی ہے۔ راجا کے ماں باپ اور رشتے دار بڑی دھوم دھام سے جیل کے باہر ڈولی لے کر آتے ہیں۔ رانی کو قید سے رہائی ملتی ہے اور اس کے بچے کو باہر لایا جاتا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''راجا نے پولیس آفیسر سے سوال کیا ''رانی کہاں جا رہی ہے؟''

''اپنے ملک'' آفیسر نے جواب دیا۔

''مگر کیوں؟''

''کیوں کہ یہ اس کا ملک نہیں ہے۔''

راجا گھبرایا، اس نے کہا ''سرحد کتنی تیز ہے جو رشتوں کو توڑتی ہے۔''(13)

رانی اور بچے کو سرحد پر لایا گیا۔ راجا اور اس کے گھر والے بھی سرحد پر پہنچ گئے۔ رانی کو سرحد کی دوسری جانب چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن جوں ہی رانی اپنے بچے کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہے تو سپاہی اسے روکتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے لیے حکم نہیں ہے۔ راجا نے بچے کو تھاما۔ دوسرے ملک کے سپاہیوں نے بھی بتایا کہ بچے کو ملک میں آنے کا حکم نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید معصوم رضا فرماتے ہیں:

> ''آنند لہر نے اس ناول کے ذریعے دلوں کو جوڑنے والی سرحد کی تمنا کی ہے یا پھر ایسی کوئی سرحد ہی نہ ہو جس کا دل پر زور چلے۔ ان کا یہ ناول زندگی کی حقیقتوں سے بالکل قریب معلوم ہوتا ہے۔''

وہ آگے لکھتے ہیں:

> ''آنند لہر کی یہ خاصیت ہے کہ وہ افسانوی روپ میں قصہ اور کہانی پر خاص دھیان دیتے ہیں جس سے قاری کا تجسس برقرار رہتا ہے۔ ناول انسانی زندگی سے بہت قریب ہے۔ آنند لہر نے کشمیر کے پس منظر میں سرحد پر آباد لوگوں کے فطری مسائل کو حل کرنے کے لیے سرکار اور سیاستدانوں کی توجہ مرکوز کرانے کی کوشش کی ہے۔''(14)

سرحد کسی بھی ملک کی تقسیم کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔ ہر ملک میں وہاں کے باشندوں کے علاوہ ان کی اپنی حکومت ہوتی ہے۔ پہلے دور میں راجا، مہاراجا ہوا کرتے تھے لیکن بعد میں جب جمہوری نظام قائم ہوا تو اکثر ملکوں نے جمہوریت کو اپنایا جہاں ان کی اپنی حکومت ہوتی ہے اور اپنے نمائندوں کو وہاں کی عوام خود چنتی ہے۔ کوئی آزاد ملک خود مختار ہے اور وہاں کی مقرر جغرافیائی سرحد ہوتی ہے جہاں اس ملک کے باشندے رہتے ہیں لیکن اس کے باہر دوسرا ملک ہوتا ہے اور اس ملک کے ساتھ باضابطہ سرحد قائم کی جاتی ہے اور آج سے نہیں بہت پہلے سے ایسا نظام قائم ہے۔ سرحد پر رہنے والے لوگوں کی ایک عام بات یہ ہوتی ہے کہ اگرچہ وہ لوگ سیاسی طور پر الگ الگ ملکوں کے باشندے ہوتے ہیں لیکن جغرافیائی اور تہذیبی سطح پر ان کا رہن سہن، زبان، تہذیب بھی ایک ہی ہوتی ہے اور جب ملکوں میں امن چین ہوتا ہے اس وقت تو بہتر ہوتا ہے لیکن جب اندرونی یا بیرونی مسائل بڑھ جاتے ہیں پھر سرحد پر رہنے والوں کو مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ان کو خوف و

ہراس کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ان کی جان و مال کا نقصان ہوتا ہے۔خوف ودہشت ہر وقت رہتی ہے۔گولی باری جب بھی ہوتی ہے وہی لوگ اس کا شکار بنتے ہیں۔سیاستدان سیاست کرتے رہتے ہیں اور باقی لوگ بحث ومباحثہ کر کے اپنی اپنی رائے دیتے رہتے ہیں۔وہاں پر لوگوں کو بنیادی ضروریات بھی میسر نہیں ہوتیں۔اس کے علاوہ بھی وہ لوگ اپنا وقت کسی طرح گزارتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے بچوں کی پرورش وتعلیم پر ان مسائل کا اثر پڑتا ہے۔

آنند لہر کے آبا واجداد بھی سرحد کے پاس ہی رہتے تھے لیکن بعد میں حالات کی وجہ سے وہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔انھوں نے ہجرت کے حوالے سے جو افسانے تحریر کیے ہیں ان میں حقیقی واقعات ہیں اور ناول ''سرحدوں کے بیچ'' جس میں انھوں نے سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں کا جائزہ لیا ہے اور ان کی روزمرہ کی زندگی اور عادت واطوار کا بھی ذکر کیا ہے۔یہ محض ایک ناول نہیں ہے بلکہ وہاں کے لوگوں کو جو مسائل درپیش ہیں آنند لہر نے فنکارانہ انداز میں ان مسائل کی عکاسی کی ہے۔

☆☆☆

حواشی:

(1) آنند لہر،کورٹ مارشل،جموں:مانوی پرکاشن،2006،ص:30

(2) ایضاً،ص:106

(3) ایضاً،ص:109

(4) ایضاً،ص:145

(5) ایضاً،ص:149

(6) ایضاً،ص:150

(7) آنند لہر،بٹوارہ،دہلی:اردو بک سوسائٹی،2009،ص:17

(8) ایضاً،ص:73

(9) ایضاً،ص:100

(10) آنندلہر،سرحد کے اس پار،دہلی: سیمانت پرکاشن،2001،ص:12

(11) ایضاً،ص:15

(12) آنندلہر،سرحدوں کے بیچ،دہلی: ناشر بک ڈپو،2001،ص:19

(13)

(14) سید معصوم رضا،کل اور آج کے فنکار،ادبی وتہذیبی رسالہ،گوالیار،جولائی،2004

(ج)

آنند لہر کے فکشن میں عورت

کسی بھی عہد میں عورت کا درجہ اور مقام یکساں نہیں رہا بلکہ وقت اور ماحول کی تبدیلیوں کے ساتھ عورتوں کی سماجی حیثیت بدلتی رہی ہے۔ تاریخ ہند کے ہر دور میں سماجی شعور کی یہ مانگ رہی ہے کہ عورتوں کی حیثیت کے بارے میں فراخدلانہ رویہ ہونا چاہیے لیکن یہ بھی ایک حقیت ہے کہ ان کے حقوق آزادی سلب کی جاتی رہی۔ پہلے ان کو محض گھر کے کام کرنے تک ہی مصروف رکھا جاتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی سوچ میں ترقی ہوئی اور عورتیں ہر میدان میں آگے آنے لگیں اور اپنی صلاحیتوں کا جوہر دکھانے لگیں۔ آج عورتیں مردوں سے ہر میدان میں آگے نکل رہی ہیں۔ یعنی کہ ہر میدان میں عورت مرد کے ساتھ کندھا ملا کر چل رہی ہے۔ پہلے اس کو موقع نہیں دیا جاتا تھا اور اسے کمزور سمجھا جاتا تھا لیکن عورت کو جب موقع ملا تو اس نے ثابت کیا کہ وہ کسی سے کم نہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آج بھی انسان نے ہر فن میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ ہر روز نئی نئی ایجادات کر رہا ہے لیکن عورت کا استحصال آج بھی ہو رہا ہے حالاں کہ عورت کے تحفظ کے لیے سرکاری و غیر سرکاری تنظیمیں ہر ممکن اقدامات کر رہی ہیں لیکن پھر بھی عورتوں کا استحصال ہو رہا ہے۔

اردو فکشن میں ہر دور کے فنکاروں نے عورت کے مختلف مسائل کو فنکارانہ انداز میں اپنی تخلیقات کے ذریعے پیش کیا اور جس طرح اس کے مسائل کی نوعیت بدلتی گئی اسی طرح فنکاروں نے ہر مسائل کو باریکی سے پیش کیا۔ جہاں تک آنند لہر کے فکشن کا تعلق ہے تو انھوں نے نہ صرف عورت کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے بلکہ عورت ان کے فکشن کا اہم موضوع ہے۔ آنند لہر اگر چہ کئی فنکاروں سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن ان کا اپنا الگ انداز ہے۔ انھوں نے موجودہ حالات کو ناول اور افسانوں کے ذریعے بخوبی پیش کیا ہے۔

آنند لہر نے جن افسانوں میں عورت کے مسائل کو ابھارنے کی کوشش میں ان میں ''دادی ماں''، ''دعا''، ''سنہرا کفن''، ''چند لمحے''، ''ویشیا''، ''گوتم بدھ سڑک''، ''یہ سرحدیں''، ''انصاف''، ''ہار کی جیت''، ''بیراگن''، ''درمیان میں وہ''، ''گھر''، ''عورت''، ''کئی رنگ''، ''طلاق''، ''اس روز''، ''سڑک انصاف کرے گی''، ''تلاش''، ''گوری''، ''شکست''، ''واپسی''، ''چھوٹی سی آواز''، ''پھول والی''، ''تندور''، ''جسم بستی'' وغیرہ اہم ہیں۔

افسانہ ''دادی ماں'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں آنند لہر نے ایک بوڑھی عورت کے کردار کو پیش کیا ہے جس کے دو پوتے ہیں اور وہ رات ان کا خیال رکھتی ہے۔ ان کو وقت پر کھانا کھلاتی ہے، سلاتی ہے، جب بڑے ہو جاتے ہیں تو اسکول بھیجتی ہے، ہر وقت ان کی فکر میں لگی رہتی ہے لیکن جب وہ بڑے ہوتے ہیں تو وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر جانا چاہتے ہیں لیکن انھیں پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لیے وہ اپنی زمین بیچنا چاہتے ہیں لیکن اس پر ان کی دادی کا حق ہے جس کی وجہ سے وہ یہ زمین بیچ نہیں سکتے۔ اس وقت ان کو اپنی دادی ماں ایک بیکار چیز نظر آتی ہے حالانکہ اس نے پوری عمر ان کی خدمت کی ان کو بڑا کیا اور ان کی پرورش کی۔ آخر میں وہ دونوں ایک ایسی ترکیب سوچتے ہیں کہ ''جب تک یہ بوڑھی زندہ ہے تو ہم زمین بیچ نہیں سکتے اس لیے ہم کو اس کو مارنا ہوگا۔'' لیکن دوسری طرف انھیں یہ بھی خیال رہتا ہے کہ اسی نے انھیں پال پوس کر بڑا کیا ہے اور پھر وہ ایسا کچھ نہیں کر پاتے ہیں اور اسی تذبذب و کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں اور جب صبح جاگتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کی دادی کی لاش چارپائی پر پڑی ہے۔ اس نے ٹوٹے الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔

''اپنا خیال رکھنا جب مجھے جلا کر آؤ تو آ کر کھانا کھا لینا اور اپنا خیال رکھنا۔''(1)

مختصر افسانے میں آنند لہر نے ایک ایسی بوڑھی عورت کا ذکر کیا ہے جو بے سہارا بچوں کو پال پوس کر بڑا کرتی ہے لیکن بعد میں وہی لوگ اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے اس کو مارنا بھی چاہتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی وہ عورت ان کے لیے فکر مند رہتی ہے۔ آنند لہر نے اس افسانے میں ایک ایسی عورت کا ایثار کے جذبے کو بیان کیا ہے جو خود کو بھول کر دوسروں کا خیال رکھتی ہے۔

افسانہ ''دعا'' مختصر مگر دلچسپ افسانہ ہے۔اس میں آنند لہر نے عورت کے الگ الگ چہروں کو دکھایا ہے۔غلاں ایک ایسی عورت ہے جو اگر چہ مذہبی رسومات ادا نہیں کرتی لیکن اپنے پڑوس کے انسانوں کے علاوہ جانوروں کا بھی خیال رکھتی ہے لیکن خدا نے انھیں ایسی نعمت بخشی ہے کہ جس کے لیے بھی دعا کرتی ہے وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ دوسری عورت شانتی ہے جو اپنے گھر،شوہر، بیٹے اور بہو کا پورا خیال رکھتی ہے۔گھر کا ہر کام کرتی ہے۔اس کا شوہر اپنے کام میں ہی مصروف رہتا ہے۔کسی کا حال تک نہیں پوچھتا۔اس کے بیٹے اور بہو بھی یوں ہی وقت گزارتے ہیں۔اس کا ہاتھ تک نہیں بٹاتے لیکن جب وہ بیمار پڑتی ہے تو گھر میں دوسری عورت میں کام کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے۔اگر چہ غلاں کو وہاں دعا کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے لیکن وہ کچھ وقت کے بعد آتی ہے تب تک ایک عورت جس کو پیسے دے کر گھر کا کام کرایا جاتا ہے۔وہ عورت جب کام کر کے پیسے لے کر گھر جاتی ہے تو اس کے گھر میں ہر کوئی اپنی اپنی خواہش کے مطابق ان پیسوں سے اپنی ضرورت پوری کرنے کی بات کرتا ہے۔اس کے بچے غلاں سے کہتے ہیں کہ ایسی دعا کرو کہ شانتی بیمار ہی رہے اور ہم پیسے کماتے رہیں۔

اس مختصر افسانے میں آنند لہر نے جہاں ایک طرف عورت اپنے گھر کے تمام فرائض انجام دیتی ہے تو دوسری طرف اس کی بہو اس میں ہاتھ نہیں بٹاتی بلکہ بیکار پڑی رہتی ہے۔اس کے علاوہ وہ عورت جو کام کر کے پیسے کما کر اپنے گھر والوں کو پالتی ہے۔ایسے کئی واقعات ہمارے سماج میں دیکھنے کو ملتے ہیں جن کا ذکر فنکار اپنی تخلیقات میں بخوبی کرتے ہیں۔

افسانہ ''سنہرا کفن'' عورت کے موضوع پر مبنی ہے جس میں ایسے گھر کی کہانی بیان کی گئی ہے جہاں گوبند کی شادی کے بعد نوکری لگ جاتی ہے۔ہر کوئی خوش ہوتا ہے اور پہلی تنخواہ کے انتظار میں مشورے کرنے لگتا ہے اور ہر کوئی اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے کے منصوبے بناتا ہے لیکن جب تنخواہ آتی ہے تو اس کی بیوی پیسے لے کر بازار چلی جاتی ہے جہاں اس کی ملاقات اس کی سہیلی ہوتی ہے جو بہت امیر ہے۔اس کے کہنے پر وہ ایک مہنگا شال خریدتی ہے جس پر سارے روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔دوسری طرف اس کے گھر میں ہر کوئی انتظار میں ہوتا ہے کہ وہ آئے اور ہر کوئی اپنی پسند کے مطابق پیسے خرچ کرے۔جب وہ ان لوگوں کی باتیں سنتی

ہے تو وہیں بیہوش ہو جاتی ہے اور وہیں مر جاتی ہے۔ ہر کوئی سمجھ جاتا ہے اور جذباتی طور پر اس پر آنسو بہاتے ہیں اور اسی شال کو اس کی لاش پر کفن کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔

آنند لہر نے اس افسانے میں عورتوں کی نفسیات کے ایک رخ کو اجاگر کیا ہے۔ وہ نفسیات اگر چہ ہر انسان کے اندر رہتی ہے عورتوں میں یہ بات خاص طور سے رہتی ہے کہ دوسری عورت کے سامنے اپنے گھر، شوہر اور دیگر چیزوں کی تعریف کرتی ہے اور اس کے علاوہ کسی بھی دوسری عورت سے پیچھے نہیں رہنا چاہتی ہے اور ہمیشہ دوسری عورت اچھا اور عمدہ کپڑا پہننا چاہتی ہے۔ اس وقت یہ خیال نہیں رکھتی کہ اس کی آمدنی کتنی ہے اور خرچ کتنا کرنا ہے۔ ایسی ہی عورتوں کی نفسیات کو آنند لہر نے اس افسانے میں اجاگر کیا ہے۔

افسانہ ''چند لمحے'' جس کا موضوع عورت ہے۔ اس افسانے میں آنند لہر نے ایک ایسی خوش مزاج عورت کی کہانی بیان کی ہے جو ہنستی بولتی رہتی ہے یعنی کہ ہر کسی سے خوشدلی سے ملتی ہے۔ ہر کام اچھے سے کرتی ہے۔ ہر کسی کی خدمت کرتی ہے اور سسرال میں بھی ساس سسر کے ساتھ تمام لوگوں سے اچھے سے پیش آتی ہے۔ محلے کے لوگ بھی اس کی عزت کرتے ہیں اور اس کا شوہر فوج میں ہوتا ہے لیکن بعد میں وہ جنگ میں شہید ہو جاتا ہے۔ وہ بیوہ ہو جاتی ہے اور بعد میں اس طرح خوش نہیں رہتی ہے۔ ان کے گھر کرشن کا دوست آتا رہتا ہے اور اس کے ساس سسر کو سہارا بھی دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ وہ کرشن کی تعریفیں کرتا ہے۔ اس کے بچپن کے بارے میں باتیں کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے جسے آشا سمجھ جاتی ہے۔ ایک دن ان کے سبھی گھر والے میلے میں جاتے ہیں اور آشا میں اکیلی رہ جاتی ہے اور کرشن کا دوست آکر اس سے باتیں کرنے لگتا ہے اور پھر کرشن کی جوانی کی باتیں بھی بتاتا ہے۔ اس کے بعد وہ آشا کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے۔ آشا کچھ نہیں کر پاتی ہے اور جب آشا بغاوت کرتی ہے اور رونے لگتی ہے۔ اس بات کا جب لوگوں کو پتہ چلتا ہے تو کوئی بھی آشا سے بات نہیں کرتا اور ہر کوئی اس سے نفرت کرتا ہے۔

اس افسانے میں آنند لہر نے ایسی خوش مزاج عورت کی کہانی ہے جس کو وقت الگ الگ حالات سے آشنا کراتا ہے۔ ایک طرف وہ بیوہ ہو جاتی ہے اور دوسری طرف اس کا استحصال کیا جاتا ہے۔ سماج کے دیگر افراد اسے سہارا دینے کے بجائے اسے غلط سمجھتے ہیں اور اسی سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح کے

حادثات، واقعات ہمارے سماج میں اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ افسانہ حقیقت سے نزدیک نظر آتا ہے۔

''ویشیا'' آنند لہر کی ایک ایسی کہانی ہے جس میں گوپالنی کے علاوہ کچھ اور بھی کردار ہیں۔ گوپالنی نام کا ایک عورت ہے جو جسم بیچنے کا دھندہ کرتی ہے۔ دین دیال جو ایک مندر کا پجاری ہے۔ گوپالی ہمیشہ کہتی ہے:

''جسم کا دھندہ سب سے مشکل کام ہوتا ہے نہ یہ دنیا اپنی نہ وہ دنیا۔''(2)

گوپالنی کو بس اتنا یاد ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ریلوے اسٹیشن گئی جہاں سے کوئی اسے اٹھا لے گیا تھا اور اس دھندے میں جھونک دیا۔ وہ یہیں بڑی ہوئی۔ اس کے پاس مختلف قسم کے لوگ آتے تھے اور پیسے دے کر اپنی جنسی خواہشات پوری کرتے تھے۔ وہیں دوسری طرف دین دیال جو ایک تیاگی اور برہمچاری ہے جس کو اپنے علم پر فخر ہے جب وہ گوپالنی کو دیکھتا ہے تو اس سے نفرت کرتا ہے اور اس سے دور رہتا ہے۔ حالانکہ اُرملا نامی لڑکی کو وہ بہت پسند کرتا ہے۔ ایک دن اچانک سارے محلے کا پانی ختم ہو جاتا ہے لیکن گوپالنی کے یہاں پانی کی کوئی کمی نہیں ہے۔ دین دیال کو پوجا کرنے سے پہلے صاف صفائی کے لیے پانی کی ضرورت ہے اس لیے اسے مجبوراً گوپالنی کے یہاں جانا پڑتا ہے۔ بعد میں اسے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ کوئی بھی انسان اچھا یا برا نہیں ہے۔ یہ انسانی سوچ ہی ہے جس کی وجہ سے انسان ان باتوں میں الجھا رہتا ہے۔ دنیا میں جو بھی کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے لیکن دوسری بات یہ بھی ہے کہ سماج میں ایسا بھی ہوتا ہے جو انسان خود اپنے عمل سے کرتا ہے یعنی کہ سماج میں کئی بدعتیں ہیں ان کا ذمہ دار صرف انسان ہی ہے۔ اس مختصر افسانے میں آنند لہر نے ہمارے سماج کے لوگوں کی ذہنیت کی طرف توجہ دلائی ہے جہاں وہ اپنی جنسی خواہش پوری کرنے کے لیے ایک عورت کو ایسا کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور وہیں اس کو نفرت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہی انسانی سوچ ہے جس کی طرف آنند لہر نے اشارہ کیا ہے اور انسانی سوچ کو بدلنے کا پیغام دیا ہے۔

''گوتم بدھ سڑک'' بھی عورت کے موضوع آنند لہر کا ایک اچھا افسانہ ہے۔ اس میں ایک ایسا کردار بھی ہے جسے اس بات کی جانکاری نہیں ہے جب وہ رکشہ والے سے گوتم بدھ سڑک کا نام سنتا ہے تو اس کے دل میں عجیب طرح کے خیالات آتے ہیں۔ اس کو یہ معلوم نہیں کہ یہاں جسم فروشی کا دھندہ ہوتا ہے بلکہ گوتم بدھ نام سنتے ہی اس کے دل میں نیک خیالات آتے ہیں۔ آگے جا کر رکشہ والا اس سے کہتا ہے:

''صاحب مال چاہیے تو دلالوں کے چکر میں مت پڑیئے گا میں بھی تازہ
مال دلاسکتا ہوں۔''(3)

اس کا یقین اور مضبوط ہوگیا۔ اسے لگا کہ یہاں مال کتابوں کو کہتے ہیں لیکن آگے جا کر چھت پر اسے ایک لڑکی دکھائی دی جو اسے آواز دے کر بلا رہی تھی۔ وہ اوپر چلا گیا اور اس نے لڑکی نے بیبا کی سے کہا: ''دھندہ بڑا خراب ہے۔ دو دن سے کوئی گاہک نہیں آیا کیوں کہ یہ کام اب بڑے لوگوں کے گھروں میں ہوتا ہے جہاں نہ لائسنس کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کوئی پولیس کا خطرہ''۔ وہ ساری بات سمجھ جاتا ہے اور تفصیل سے اس بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ وہ لڑکی اسے تفصیلاً سب کچھ بتا دیتی ہے کہ اسے مجبوراً یہ سب کرنا پڑتا ہے لیکن بڑے بڑے لوگوں کے یہاں یہ عام طور سے ہوتا ہے جہاں ان کو کسی سے بھی خطرہ نہیں۔ اور یہ ہمارے سماج میں اکثر ایسے ہی ہوتا آرہا ہے۔ اس کو لگا کہ سڑک کا نام گوتم بدھ اس لیے ہے کہ یہاں کوئی بھی احتجاج نہیں کرتا۔ باپ بیٹی کی عزت لٹ جانے پر بھائی بہن کی بے حرمتی پر نہ کوئی قانون اور نہ کوئی عدالت احتجاج کرتی ہے۔ بعد میں لڑکی نے اس سے کہا کہ تم جلدی آجاؤ تاکہ میں کچھ کھا سکوں۔ اس نے لڑکی کو دس روپیے دے دیئے۔ اور دوسری عورت کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ وہ بھی اپنی کہانی اسی طرح بتاتی ہے کہ مجبوراً اس کو یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کی بات سن کر وہ وہاں سے چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی رکشہ والا وہاں آتا ہے اور اس سے کہتا ہے:

''وہ میرا گاہک تھا۔''(4)

مختصر افسانے میں آنند لہر نے عورت کی ایسی بدقسمتی کو بیان کیا ہے جسے مجبوری کے عالم میں جسم کا دھندہ کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ دور میں جسم فروشی کا ایک بہت بڑا کاروبار چل رہا ہے اور جسے کوئی عام آدمی نہیں بلکہ سماج کے بڑے ٹھیکیدار چلاتے ہیں اور لاچار عورتوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر انھیں اس دھندے میں جھونک دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ معصوم بچیوں کو بھی اغوا کر کے ان کی زندگیاں برباد کی جاتی ہیں۔ گرچہ یہ ایک مختصر افسانہ ہے لیکن اس میں آنند لہر نے ہمارے سماج کی ایک ایسی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے جو اس دور کا بہت بڑا المیہ ہے۔

افسانہ ''انصاف'' میں آنند لہر نے ایک ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی ہے جو گھر میں اکیلی ہوتی ہے اور جس کا فائدہ ایک نوجوان اٹھاتا ہے اور اس کے گھر میں آکر اس کی عزت لوٹ لیتا ہے۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی لیکن اس کا پڑوسی سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد محلے کے لوگ بھی آئے اور پولیس نے آکر مقدمہ بھی درج کر کے

چھان بین شروع کردی۔ اس دوران کافی عرصہ گزر گیا۔ اس کی شادی ہوگئی اور بچے بھی ہوئے۔ وہ اپنے سسرال میں بہت خوش تھی اور ہر کوئی اس سے خوش تھی۔ وہ اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔ ایک دن اچانک ان کے گھر کے سامنے پریس والے کچھ لوگ آئے اور اس کے سسر سے پوچھنے لگے کہ آج جس کو سزا ملی ہے اس بارے میں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اس کے شوہر سے بھی یہی سوال دہرایا گیا جس کا اسے کوئی علم نہ تھا۔ وہ سبھی حیران ہوگئے۔ ہر کوئی ندامت اور غصے میں اس سے نفرت کرنے لگا اور اس کے بارے میں بری بھلی باتیں کرنے لگا۔

یہ ایک مختصر افسانہ ہے لیکن اس میں آنند لہر نے ایک ایسے سماجی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے جہاں ایک عورت بے بس نظر آتی ہے اور یہ آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے ہوتا آ رہا ہے جہاں عورت نہ چپ رہ سکتی ہے اور نہ کچھ بتا سکتی ہے۔ اور صدیوں سے اسی طرح سے عورت کا استحصال ہوتا رہا ہے۔

''تندور'' آنند لہر کے افسانوی مجموعے ''سرحد کے اس پار'' میں شامل ہے۔ اس میں آنند لہر نے عورت کے ساتھ صدیوں سے ہو رہے ظلم و ستم کی اشارہ کیا ہے۔ افسانے میں کچھ لوگوں کا ذکر ہے جو ایک جگہ بیٹھ کر لوگوں کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔ جہاں پر ہر عمر کے لوگ ہیں اور جن کی اپنی بیٹیاں، بیویاں اور ماں بھی ہیں لیکن اس کے باوجود بھی وہ ایسی باتیں کرنے سے پرہیز نہیں کرتے۔ ان کے علاوہ مذہبی رہنما، اخلاقی پرچار کرنے والے، جج، سیاسی رہنما کے علاوہ تمام لوگ یہ باتیں سنتے ہیں۔ ایک نے لڑکی سے پوچھا:

> ''تمہاری عمر کیا ہے؟'' لڑکی نے جواب دیا ''سترہ برس''۔ جھوٹ بولتی
> ہو بالکل جھوٹ بولتی ہو۔ لڑکی حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور
> پھر بولنے لگی ''نہیں حضور بالکل سچ۔ آپ میرا جسم دیکھ لیں، ٹٹول لیں،
> میری چھاتیوں کو اچھی طرح سے دیکھ لیں۔'' (5)

یہ سن کر وہ شرمندہ ہو جاتا ہے لیکن وہ اصل میں اس لڑکی عمر نہیں بلکہ ایک عورت کے وجود کی بات کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہونے والے استحصال کی بات کر رہا تھا۔ اور بعد میں کہنے لگا کہ تمہاری عمر ہزاروں برس ہے اور جب لڑکی نے اس بارے میں پوچھا تو اس نے تفصیل سے بتایا:

> ''ہزاروں برس سے دوشاسن تمہاری ساڑی اتار رہا ہے۔ عیسیٰ کو جنم

دینے کے بعد تم پر الزام لگائے گئے۔ یگوں سے تمہارا سودا ہو رہا ہے۔ تم
بک رہی ہو، نیلام ہو رہی ہو۔ تم کہتی ہو کہ تمہاری عمر سترہ برس ہے۔
صدیاں گزر گئیں۔ ماں بہن ہو کر بھی دیوی ہو کر بھی تمہارا بدن چاٹ کی
طرح بک رہا ہے۔ لوگ تمہارے گیارہ برس کے بدن کو ساٹھ برس کی
ہوس کے ترازو میں تول رہے ہیں۔''(6)

یہاں آنند لہر نے عورت کے استحصال کی ایک تاریخ رقم کی ہے کہ قدیم دور سے ہی عورت کے ساتھ ظلم ہوتا آ رہا ہے۔ مہابھارت کے وقت کا واقعہ بھی بیان کیا ہے جب دوشاسن دروپتی کی ساڑی اتاڑتا ہے۔ اس وقت کی عورت کے ساتھ ہونے والے ظلم سے لے کر آج تک عورتوں کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے سماج میں ایسی بھی بہت ساری حقیقی کہانیاں ہیں جہاں لڑکیوں کو ان کے والدین ہی بیچ دیتے ہیں اور جن کو جنسی دھندوں میں جھونک دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں عورت کو دیوی کا درجہ دیا جاتا ہے اور اس پر ہر طرح کے ظلم و ستم بھی کیے جاتے ہیں اور وہ برداشت کرتی رہتی ہے۔ حالانکہ وہ بھی کسی بھی ماں بہن بیٹی ہوتی ہے لیکن اسی تندور میں جلنا ہوتا ہے جہاں ایک عرصے سے کئی جوانی جلتی ہے اور سماج کے بڑے بڑے ٹھیکیدار اس تندور کو جلائے رکھتے ہیں۔ آنند لہر نے جنسی پیشے کو تندور کے استعارے سے پیش کیا ہے۔

''جسم بستی'' بھی ایک ایسی کہانی ہے جس میں عورت کی لاچاری، بے بسی اور مجبوری کو اجاگر کیا گیا ہے جہاں سیاستدان عوام کی خدمت کے بجائے اپنی ذاتی مصروفیات میں مگن رہتے ہیں اور عورتوں کو بھی اپنی ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

افسانہ ''چھوٹی سی آواز'' میں عورت کے ایک ایسے پہلو کو دکھایا گیا ہے جہاں ان کی آواز کو چڑیوں کی آواز سے مطابقت دی ہے یعنی چڑیا بھی دیگر پرندوں سے مختلف ہوتی ہے اسی طرح عورت کی آواز میں بھی معصومیت ہوتی ہے اور جس طرح چڑیا کے گھونسلے میں سانپ آتا ہے اور وہ ان کو نگل جاتا ہے، ان کی معصومیت کا خیال نہیں رکھتا اسی طرح مرد بھی معصوم عورتوں کو بے رحمی سے اپنی ہوس کا شکار بناتے ہیں۔ اگرچہ وہ احتجاج بھی کرتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جب بھی کسی مظلوم پر ظلم ہوتا ہے تو دیگر جانور بھی احتجاج کرتے ہیں۔ کتا بھونکنا بند کر دیتا ہے مگر لوگ اس کی وفاداری پر شک کرتے ہیں۔ اگرچہ ایسا جانور بھی نہیں کرتے ہیں۔

اس مختصر افسانے میں آنند لہر نے انسان کی انسانیت کو جانوروں کے ذریعے طنز کیا ہے کہ جانور کبھی بھی دوسرے معصوم کا استحصال یا اس پر ظلم نہیں کرتے لیکن انسان انسان ہو کر بھی یہ سب کرتا آیا ہے۔

افسانہ ''گوری'' ایک عشقیہ کہانی ہے، جس میں روشن نام کا کردار ہے۔ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ گوری مٹی کے برتن بناتی ہے اور لوگ اسے خریدتے ہیں۔ وہ دونوں الگ الگ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے کسی سے کچھ بھی نہیں کہتے ہیں۔ ان کے گھر والے ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن سماج میں جو رسم و رواج اور عقیدے ہیں ان کے بھی اپنے تقاضے ہیں اگر چہ محبت کے لیے کسی مذہب کی ضرورت نہیں۔ انسان کسی بھی مذہب کو مانے یا مذہبی اصول نہ جانے پھر بھی ایک اچھا انسان بن سکتا ہے لیکن ہمارے سماج میں اکثر لوگ ذات اور مذہب میں ہی الجھے رہتے ہیں اور یہ بات بھی ہے کہ ہر مذہب محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی لوگ اس میں گروہ بندی کرتے ہیں:

> ''گوری ایک دن پریشانی کے عالم میں اپنے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔
> روشن آیا اور کہنے لگا ''گوری خوش ہو جاؤ سارا مسئلہ ختم ہو گیا۔ میں نے
> اپنا مذہب بدل لیا ہے۔'' گوری نے ایک دم جواب دیا: ''تم نے یہ کیا
> کیا، تمھیں پانے کے لیے میں نے تمہارا مذہب اپنایا۔''(7)

اس طرح کے مسائل ہمارے سماج میں اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن انھی وجوہات کی بنا پر حادثات ہوتے ہیں اور ہر کوئی اپنے مذہب تک ہی محدود رہنا چاہتا ہے۔ آنند لہر نے اس میں خاص بات یہ کہی ہے کہ محبت ایک آفاقی جذبہ ہے اور جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو مذہب کا کام سماج میں امن و امان قائم کرنا ہے لیکن لوگ اس کو نفرت و تعصب کا ذریعہ بنا دیتے ہیں اور اسی میں الجھے رہتے ہیں۔

☆☆☆

حواشی:

(1) آنندلہر، بٹوارہ، دہلی: اردو بک سوسائٹی، 2009، ص:25

(2) آنندلہر، کورٹ مارشل، جموں: مانوی پرکاشن، 2006، ص:73

(3) ایضاً، ص:85

(4) ایضاً، ص:91

(5) آنندلہر، سرحد کے اس پار، دہلی: سیمانت پرکاشن، 2001، ص:65-66

(6) ایضاً، ص:66-67

(7) ایضاً، ص:38

باب چہارم

آنند لہر کے فکشن میں دیگر موضوعات: مجموعی جائزہ

ادب کو سماج کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ ہر فنکار اپنے دور کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور ان حالات کو وہ ہو بہو لیکن فنکاری کے ساتھ اپنی تخلیقات کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اگر کسی بھی سماج یا قوم کی تاریخ یا تہذیب کے بارے جاننا ہو تو اس وقت کے ادب کا مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس وقت کی تہذیب، روایت، رسم و رواج کے علاوہ تمام سیاسی، سماجی پہلو فنکاروں کی تخلیق میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ قدیم دور سے عہد وسطیٰ راجا، مہاراجا کا دور رہا ہے۔ اس وقت کے سماج کے مختلف مسائل رہے۔ روسی انقلاب، دوسری عالمگیر جنگ جیسے مرحلے رونما ہوئے جس کی وجہ سے مشرق و مغرب میں سماجی و سیاسی تبدیلیاں ہوئیں۔

جدید دور ہندستان کی تاریخ میں ایک اہم دور مانا جاتا ہے چونکہ یہ دور جدوجہد آزادی کا دور رہا ہے اور اتنا ہی نہیں ہمارے سماج میں کئی سطح پر تبدیلیاں آئیں اور یہ واقعہ نہ صرف تاریخ میں درج ہے بلکہ اس کے ادیب و فنکار نے اسے اپنی تخلیقات کا ذریعہ بنایا۔ جدوجہد کے نتیجے میں ملک کی آزادی لیکن اس کے ساتھ ہی ملک کا بٹوارہ جو ایک المیہ ثابت ہوا۔ ان تمام مسائل کو فنکاروں نے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا اور اس کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا۔ ملک میں جمہوری نظام قائم ہونے کے بعد بھی مختلف مسائل درپیش ہوئے۔ سیاست کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ مسائل کو حل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی اور اس طرح یہ عمل آگے بڑھتا رہا۔ ملک کے دیگر حصوں کے اپنے اپنے مسائل رہے جن کو فنکاروں کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔

ریاست جموں و کشمیر آزادی کے بعد ہمارے ملک کا ایک ہم سیاسی مسئلہ رہا اور جس کا حل آج تک نہیں ہو پایا۔ اگرچہ سیاسی طور پر اس مسئلے کا حل کرنے کی کوشش جاری ہے لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات ناساز ہو رہے ہیں اور جس کا شکار صرف اور صرف وہاں کی عوام بن رہا ہے۔ وہاں کی عوام کے علاوہ ادیب و فنکار ان حالات سے متاثر ہوئے اور ان مسائل کو موضوع بنا کر اپنی تخلیقات میں پیش کرتے رہے ہیں۔ دیگر فنکاروں کی طرح آنند لہر نے بھی اپنے وقت کے حالات کو موضوع بحث بنایا اور اپنی تخلیقات کے

ذریعے پیش کیا۔ آنند لہر نے ناول، افسانے اور ڈرامے تخلیق کیے ہیں اور ان میں انھوں نے مخصوص مسائل کے علاوہ دیگر کئی سماجی اور سیاسی مسائل کو بھی پیش کیا ہے۔

ان کے فکشن میں ہجرت، سرحد اور عورت کے علاوہ دیگر موضوعات میں ''کھیر''، ''گواہوں کا بیوپاری''، ''اب تھانہ چل پڑے گا''، ''صرف ایک آدمی''، ''اگر ایسا ہوتا''، ''خالی ہاتھ''، ''فائر بریگیڈ''، ''ٹھنڈا چہرہ''، ''تیروں کا کھیل''، ''تیاگ''، ''ایک خبر''، ''سمندر کا پانی''، ''موسم بدلتے رہتے ہیں''، ''دوسری بے انصافی''، ''سنہری مچھلی''، ''تھوڑی سی غلطی''، ''حساب جیومیٹری''، ''ایک داغ''، ''آگ''، ''اس نے سوچا''، ''کلفیاں''، ''سوال''، ''اور انتظار''، ''غلط علاج''، ''بدلتے رنگ''، ''ایک الگ صوبہ''، ''چھوٹے لوگ''، ''ان کے بچے''، ''تپسیا''، ''لوگ لوگ ہیں''، ''زمین کی ضرورت''، بدلتے لفظ''، ''اور پتھر رو پڑا''، ''تین دن کے بعد''، ''ووٹ بینک''، ''چناب کا پانی پھر اچھلا''، ''رام سنگھ کی خودکشی''، ''زمین کی کوئی نہیں سنتا''، ''اپنا گھر''، ''سورج گرہن''، ''رنگ ساز''، ''رشتے''، ''زندگی''، ''منو'' اور ''بنجارن'' اہم ہیں۔

آنند چونکہ پیشے سے وکیل ہیں۔ اس لیے دوران وکالت ان کا واسطہ مختلف لوگوں کے مختلف مسائل سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عدالتی نظام کو بھی آنند لہر نے بہت قریب سے دیکھا، جہاں پر لوگ حق اور انصاف کی امید لے کر آتے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ ''گواہوں کا بیوپاری'' اسی موضوع پر مبنی ہے۔ جس میں انھوں نے ایک ایسے کردار کے ذریعے ہمارے عدلیہ کی ایک حقیقت سے روشناس کرایا ہے۔ جس کا اندازہ افسانے کے موضوع سے ہی ہو جاتا ہے۔

''گواہوں کا بیوپاری'' یعنی کہ عدالت میں جب کاروائی ہوتی ہے تو وہاں گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ لوگوں کو انصاف مل سکے لیکن آج کے دور میں اگر دیکھا جائے تو وہاں عوام کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا بلکہ جو لوگ مالی طور سے بہتر ہوتے ہیں تو فرضی گواہوں کے ذریعے فیصلہ اپنے حق میں کراتے ہیں۔ غریب انسان اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کا یقین ان اداروں پر بھی نہیں رہتا لیکن کچھ لوگ اسی سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ اس افسانے میں آنند لہر نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ عدلیہ جو ہمارے سماج کا بہت بڑا انصاف کا ادارہ ہے لیکن وہاں بھی امیر اور غریب کے درمیان امتیاز برتا جاتا ہے جو موجودہ دور کی ایک

بہت بڑی حقیقت ہے۔

ان کا ایک افسانہ ''تھانہ چل پڑے گا'' جس میں انھوں نے ایک گاؤں کو موضوع بنایا ہے۔ وہاں کی عوام امن وسکون کے ساتھ رہتی تھی لیکن ان کی خدمت کے لیے پولیس چوکی قائم کی جاتی ہے بعد میں پولیس تھانہ بھی قائم کیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد وہاں کا امن وسکون ختم ہوجاتا ہے۔ وہاں پر ہر قسم کی برائی پھیلنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کے نوجوان ہر قسم کے برے کاموں میں ملوث ہیں۔ اس طرح وہاں کی پولیس بھی ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے رشوت لیتی ہے۔ یہاں تک کہ جب کوئی مرتا ہے اس کا نام فہرست میں درج کرنے کے لیے رشوت طلب کی جاتی ہے۔

آنند لہر نے اس افسانے میں ''رشوت'' جو کہ ہمارے سماج کا بہت بڑا مسئلہ ہے اور جس کا شکار خاص طور سے عام لوگ ہوتے ہیں۔ اگر چہ اسے روکنے کے لیے مختلف سطح پر کوششیں کی جارہی ہیں لیکن ابھی تک اس کا کوئی حل نہیں نکل سکا ہے۔ اور جہاں تک پولیس کا تعلق ہے ان کا کام عوام کی خدمت کرنا ہے لیکن وہ ہر چھوٹے بڑے کام سے پہلے رشوت لیتے ہیں جس کی طرف آنند لہر نے اشارہ کیا ہے۔ اگر چہ ان میں بھی ہر کوئی ایسا نہیں ہے کچھ لوگ تو دن رات ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں لیکن پھر بھی اکثر یہ مسئلہ عوام کے ساتھ درپیش رہتا ہے جو کہ موجودہ دور کی ایک حقیقت ہے۔

افسانہ ''کلفیاں'' جس میں ایک غریب انسان کی کہانی بیان کی گئی ہے جو کلفیاں بیچ کر اپنا وقت گزارتا ہے۔ اس کی یہی خواہش رہتی ہے کہ زیادہ گرمی ہوتا کہ وہ کلفیاں بیچ کر پیسے کما سکے۔ اس کے لیے وہ بازار چلا جاتا ہے لیکن وہاں کی منتری گاڑی گزرتی ہے۔ اس لیے لمبے وقت اسے رکنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے اس کی کلفیاں پگھل جاتی ہیں اور اس کی پوری محنت پر پانی پھر جاتا ہے۔

یہ ایک مختصر افسانہ ہے لیکن اس میں آنند لہر نے ہمارے سماج کی ایسی حقیقت بیان کی ہے جو لوگ عوام کی خدمت کا دعویٰ کرتے ہیں اصل میں وہ ان کے لیے کچھ نہیں کرتے حالانکہ ان کو ہر قسم کی سہولیات دستیاب ہوتی ہیں لیکن غریب آدمی کو دو وقت کی روٹی کے لیے دن رات سخت محنت کرنی پڑتی ہے لیکن بڑے لوگ ان کے منہ کا نوالا بھی چھین لیتے ہیں۔ یہ کہانی بھی ہمارے سماجی حقائق سے بہت نزدیک نظر آتی ہے۔

اسی طرح ایک اور کہانی ''چھوٹی سی غلطی'' ہے، جس میں آنند لہر نے سماجی حقائق کی عکاسی کی ہے اور اس میں یہ بتایا ہے کہ اگر کوئی امیر آدمی کتنا بھی بڑا گناہ کر لے تو اس کا پورا انتظام کیا جاتا ہے اور اسے سزا نہیں ملتی لیکن اگر غریب آدمی سے بھول کر بھی کوئی غلطی ہو جائے تو اس پر ملک کے تمام قانون لاگو کیے جاتے ہیں۔ واقعی یہ ہمارے سماج کی ایک حقیقت ہے۔

ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' جس میں آنند لہر نے موجودہ دور کے انسان کی ایسی سوچ کو اجاگر کیا جو ہر وقت ہتھیاروں کی بھاگ دوڑ میں لگا ہے اور ایٹمی طاقت بننے کا خواہشمند ہے۔ اگر چہ اس کے ملک میں دیگر کئی مسائل ہیں لیکن وہ تمام مسائل کو بالائے طاق رکھ کر ہتھیار جمع کرنے میں مصروف ہے۔ اس ناول کا موضوع اگر چہ عراق کی تباہی کے پس منظر میں ہے اور جس کے کردار پرندے اور جانور ہی ہیں اور ماضی اور مستقبل یعنی سبھی زمانوں کے حالات کو سامنے رکھ کر موجودہ حالات کا جائزہ لیا ہے۔

آنند لہر نے انسانی فطرت اور منفی سوچ، آپسی منافرت اور ایک دوسرے کے احترام نہ کرنے کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ''انسان جب اکٹھے بیٹھتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی رائے کا احترام نہیں کرتے لڑ پڑتے ہیں۔''
>
> مگر کیوں چیل نے سوال دہرایا۔
>
> کیوں کہ وہ چھوٹے بڑے ملکوں میں بٹے رہتے ہیں۔ وہ رائے کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اس بات کو اہمیت دیتے ہیں کہ کس ملک کا نمائندہ رائے دے رہا ہے اور جو رائے دے رہا ہے اس ملک کے پاس کتنے ایٹم بم ہیں، ہائیڈروجن بم کتنے ہیں۔''(1)

آنند لہر نے یہاں نہ صرف کسی ایک خطے کی بلکہ موجودہ دور میں پورے دنیا کی نہایت ہی عمدہ طریقے سے منظر کشی کی ہے۔ ہر کوئی ہتھیار جمع کر رہا ہے اور دوسرے پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہر کوئی ایک طرح سے ہتھیار جمع کرنے کی دوڑ لگ گیا ہے۔ خدا نے انسان کو اس لیے بنایا تھا کہ وہ زمین پر دوسروں کی مدد کر سکے۔ بے سہاروں کا سہارا بن سکے لیکن انسان یہاں ان ہی مسائل میں الجھ گیا ہے۔ اگر

موجودہ دور میں دیکھیں تو ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک بھی اسی طرح ہتھیار جمع کر رہے ہیں جس کی وجہ سے پوری دنیا میں ایک خوف کا ماحول بن گیا ہے۔

افسانہ ''کرائے کا مریض'' ایک ایسے بے روزگار نوجوان کی کہانی ہے جو گاؤں سے شہر کی طرف روزگار کی تلاش میں جاتا ہے وہاں اس کی ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوتی ہے جو یہ جانتا ہے کہ شہر میں کس طرح پیسے کمائے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ وہ اس کی مدد بھی کرتا ہے اور وہ ایک ایسے ہسپتال میں جہاں نقلی مریضوں کو بٹھایا جاتا ہے اور پیسے کمائے جاتے ہیں۔ وہ نوجوان وہاں کئی عرصے تک کام کرتا رہا اور پیسے کماتا رہا۔لیکن ایک دن جب وہ بیمار ہوتا ہے تو ان لوگوں نے اس کا علاج کرنے سے منع کر دیا اور اس کو وہاں سے نکال دیا۔اس طرح کے واقعات ہمارے سماج میں اکثر ہوتے ہیں، جہاں کئی لوگ پیسے کمانے کے لیے بڑے بڑے اسپتال کھولتے ہیں اور وہاں پر فرضی مریضوں کو رکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جن کا سماج میں ایک اہم درجہ ہوتا ہے آج کے دور میں وہ اپنا فرض بھول کر زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے میں لگے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ تو فرضی ڈگری لے کر ڈاکٹر بنے ہیں جس کی وجہ سے وہ اچھی طرح علاج نہیں کر پاتے بس پیسہ کماتے ہیں۔اس طرح عام لوگوں کا ان سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے۔اس کے علاوہ نیتا لوگ بھی لوگوں کو پیسے دے کر جلسے منعقد کراتے ہیں اور الیکشن کے دوران بھی یہاں تک کہ ووٹ بھی خریدتے ہیں۔

ٹھیکیدار جو تعمیر کا کام کرتے ہیں وہ اپنے کام میں گنجائش باقی رکھتے ہیں تاکہ دوبارہ وہیں کام کر کے زیادہ سے زیادہ پیسے کما سکیں۔مختصر یہ ہمارے سماج کی ایک ایسی حقیقت ہے جہاں سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر ہر کوئی اپنی مناسب آدمی کے علاوہ کمائی کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے ہر طریقہ استعمال کرتا ہے۔

''یہی سچ ہے'' آنند لہر کا دلچسپ ناول ہے جو زندگی کی سچائیوں پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے کہ کس طرح موجودہ دور میں رشوت خوری، بے ایمانی اور استحصال ہماری زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ایک ایسا کردار جو رشوت لیتا ہے لیکن وہ لوگوں کی مدد کرتا ہے اور لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ دوسری طرف دوسرا کردار ہے جو رشوت نہیں لیتا۔ مذہبی عقیدے کا پابند ہے لیکن ہر کوئی اس سے پریشان رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی بیوی اور بچے بھی کیوں کہ وہ کسی کی مدد نہیں کرتا بلکہ نصیحت کرتا رہتا ہے۔اس کے علاوہ کئی لوگ ایسے بھی جو کچھ کاموں میں اس

طرح مصروف ہیں، ان کو دنیا کی چیزیں بے کار لگتی ہیں اور جو وہ کرتا ہے اسی کو اصل سمجھتا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ چیز بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔

''نروان'' آنند لہر کے چھوٹے چھوٹے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ ''تیاگ''، ''کالی کہانی''، ''کھیل''، ''نروان''، ''گناہگار''، ''سپاہی کی واپسی'' اس میں شامل ڈرامے ہیں۔

ان تمام ڈراموں کا پس منظر دنیا، انسان، انسانی سوچ و عمل اور انسانی سماج ہی ہے جس میں رہنے والا ہر بشر دکھ درد، بیماری اور پریشانی سے نجات چاہتا ہے۔ ہر ایک دردمند اور نیک خواہشات رکھتا ہے لیکن زندگی میں خوشی اور غم ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔

''تپسوی کون'' آنند لہر کا طویل افسانہ ہے جس میں انھوں نے موجودہ دور کے مختلف لوگوں کی ذہنیت اور نفسیات کا جائزہ لیا ہے۔ جہاں ہر کوئی اپنے اپنے پیشے میں مصروف نظر آتا ہے اگر چہ وہ اپنے فرائض کو ایمانداری سے انجام نہیں دیتا ہے بلکہ جتنا ہو سکے وہ ہر طریقے سے پیسے کماتا ہے اور جب ایک دوسرے کی بات کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر لوگ اسی طرح الجھے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی ایمانداری سے اپنا کام نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ عام لوگ بھی خودغرضی اور لالچ کرتے ہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تپسوی کون ہے۔

بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنند لہر نے سماج میں ہونے والے تمام چھوٹے بڑے واقعات کو اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا ہے اور ان مسائل کے وجوہات اور نتائج کو بھی بیباکی سے بیان کیا ہے۔ آنند لہر کے کچھ افسانوں میں اگر چہ مماثلت پائی جاتی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے سماج میں اکثر واقعات و حادثات کی وجوہات جن میں تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ امیری اور غریبی ہمارے سماج کا ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ چوں کہ آئے روز مہنگائی دن بدن بڑھ رہی ہے، جس سے غریب اور غریب ہوتا جا رہا ہے لیکن امیر پر اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ وہ اس کے عوض کہیں اور سے زیادہ پیسے کما لیتا ہے۔

افسانہ ''ووٹ بینک'' ایک مختصر افسانہ ہے، جس میں آنند لہر نے موجودہ وقت کے سیاستداں جو کرسی حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں ان کو بخوبی پیش کیا ہے جو الیکشن سے پہلے عوام سے

بڑے بڑے وعدے کرتے ہیں لیکن جب وہ جیت کر سرکار بناتے ہیں تو وہ ان وعدوں کا بھول جاتے ہیں اور اکثر اپنے ذاتی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ موجودہ دور جمہوریت کا دور ہے جہاں مختلف سیاسی پارٹیاں ہیں اور جن کے مختلف نظریے ہیں اور ہمارے ملک میں تو کثیر پارٹی نظام ہے۔ اس لیے یہاں کچھ سیکولر نظریے کے حامی ہیں کچھ نیشنلسٹ، کچھ ترقی پسند، ان کے علاوہ کچھ عام لوگوں کے نمائندہ کا دعوہ کرتے ہیں۔

جب الیکشن کی مہم کا دور آتا ہے تو ہر کوئی زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ موجودہ سماجی مسائل پر بڑے بڑے جلسے منعقد کراتے ہیں اور ان کے مسائل حل کرنے کا ہر کوئی کرتا ہے۔ رشوت خوری جو ہمارے سماج میں ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اسے ختم کرنے کا ہر سیاسی پارٹی اپنے اپنے انتخابی مینی فیسٹو میں دعویٰ کرتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہی نیتا لوگ رشوت کو بڑھاوا دیتے ہیں اور جب کوئی نیتا اس الزام میں پکڑا جاتا ہے تو اس کی پارٹی اسے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے اور دیگر پارٹیاں ہنگامہ کرتی ہیں۔ اسی طرح کچھ عرصے بعد ہر کوئی اسے بھول جاتا ہے۔

> ''یہ جمہوریت ہے، صبح جب نلکے کا پانی آیا تو لگا کہ کہہ رہا ہو اگر مزدوروں، کسان، دکاندار اپنی الگ پارٹی بنا سکتے ہیں تو سیاسی لیڈر کیوں نہیں۔ ایک پارٹی کے لیڈر کے اوپر رشوت کے الزام لگے تو پارٹی اس کے پیچھے کھڑی ہوگئی پھر دوسری پارٹی کے نیتا کے اوپر الزام لگے تو پارٹی اس کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔ یہی حال تیسری پارٹی کے لیڈر کے ساتھ ہوا پھر چوتھی پارٹی کے لیڈر کے ساتھ بھی جب سب پارٹیوں کو اپنا وجود خطرے میں آیا تو انھوں نے رشوت کے خلاف ایک پارٹی کھڑی کرنے کا فیصلہ کیا۔''(2)

اس کے علاوہ آنند لہر نے الیکشن کے دوران ہونے والے سیاسی تذبذت کی عکاسی اس طرح کی ہے:

> ''پھر ہر سیاسی پارٹی نے اندر سے سمجھ لیا کہ لوگوں کی پہچان ملزم یا شریف آدمی، غریب یا امیر، ایماندار یا بے ایمان کے طور پر اصل میں ختم ہوگئی ہے۔ اب ان کی پہچان صرف دھرم یا مذہب کے نام پر ہوگئی۔ ایسا بھی

ضروری ہے کیوں کہ حکومت ووٹوں سے بنتی ہے۔'ہر طرف شور تھا''
دال، مہنگی ہوگئی ہے، سبزی مہنگی ہوگئی ہے مگر لیڈروں کو یہ بھی فکر ہے کہ اگر
سبزی مہنگی کرنے والوں کے خلاف کاروائی کی گئی تو ووٹ کم ہو جائیں
گے۔ کیوں کہ سبزی بیچنے والوں کا سبزی خریدنے والوں کا، سبزی مہنگی
کرنے والوں کا بھی ووٹ ہے۔''مگر زیادہ ووٹ کس کے ہیں۔''
ایک دوسرے لیڈر نے کہا''چیزیں مہنگی بیچنے والے چندر بھی دیتے ہیں
اور پولنگ ایجنٹ بھی بنتے ہیں۔ جلسوں اور جلوسوں میں نعرے بھی
لگاتے ہیں اور لیڈروں کے کہنے پر فساد بھی کرتے ہیں۔''(3)

واقعی یہ ایک حقیقت ہے۔آج کے دور میں اگر چہ ہمارے سماج میں مختلف مسائل ہیں جن کی وجہ سے عوام پریشان ہے لیکن پھر بھی لوگ اپنی معاشی حیثیت نہیں دیکھتے بلکہ مذہب میں الجھ جاتے ہیں۔اس طرح سیاسی رہنما ان کا استعمال کرتے ہیں۔اس کے علاوہ روزمرہ کی اشیا دن بدن مہنگی ہوتی جارہی ہے۔مہنگائی بھی آج کا ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے جس سے خاص طور پر عام لوگ متاثر ہوتے ہیں لیکن اس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی کیوں کہ سیاسی رہنما اکثر سرمایہ دار طبقے کی فکر میں رہتے ہیں اور وہ لوگ الیکشن کے دوران سیاستدانوں کی مالی مدد کرتے ہیں۔ان حالات میں عوام کو مختلف پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ عورتوں اور لڑکیوں کو جنسی ہوس کا شکار بنایا جاتا ہے۔ ہر طرف شور ہو جاتا ہے۔وہاں بھی لیڈروں کو ہمدردی دکھانے کا موقع ملتا ہے اور جو سرکار چلاتے ہیں ان کو حکومت سے ہٹانے کی بات کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ لوگ اپوزیشن کی سازش بتاتے ہیں۔

''حضور اس لڑکی کے گھر چلتے ہیں یہ ووٹ بنانے کا بہترین موقع ہے۔
اس سے ووٹ ملیں گے۔ پورے علاقے میں ہماری عزت بڑھے
گی۔''(4)

اتنا ہی نہیں اپنا سیاسی رہنما ووٹ حاصل کرنے کے لیے قیدیوں کو بھی اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔ اسی طرح آنند لہر نے کئی اور کہانیاں لکھی ہیں جن میں مختلف مسائل و موضوعات کو پیش کیا ہے۔

بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ہر دور میں ہمارے سماج میں مختلف مسائل رہے ہیں، جن سے خاص طور سے عوام متاثر رہی۔ ان مسائل کو اس وقت کے فنکار اپنی تخلیقات کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں آزادی کے بعد بھی مختلف مسائل رونما ہوئے جن کی وجہ سے عوام کو مختلف مشکلات کو سامنا کرنا پڑا۔ اگر چہ مسائل کو حل کرنے کے لیے سرکاری و غیر سرکاری تنظیمیں بھی موجود ہیں لیکن اس کے باوجود بھی ہمارے سماج میں یہ مسائل نئے روپ لے کر سامنے آتے ہیں۔ اس طرح آنند لہر نے بھی موجودہ دور کے سماج میں رونما ہونے والے مختلف مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور انھیں بخوبی پیش کیا ہے۔

☆☆☆

حواشی:

(1) آنند لہر، مجھ سے کہا ہوتا، دہلی: اردو بک سوسائٹی، 2005، ص:6

(2) آنند لہر، سریشٹھا نے بھی یہی لکھا ہے، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2015، ص:72

(3) ایضاً، ص:73

(4) ایضاً، ص:74

حاصل مطالعہ

ریاست جموں وکشمیر میں دیگر اصناف شعر ونثر کی طرح اردو فکشن کی شروعات بھی تاخیر سے ہوئی۔ ریاست جموں وکشمیر میں عصر حاضر کے فکشن نگاروں میں آنند لہر کا اہم نام ہے۔ آنند لہر بنیادی طور پر ریاست جموں وکشمیر کے ضلع پونچھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت وہیں ہوئی۔ ادبی سفر کا آغاز کالج کے زمانے سے کیا۔ کالج میں ''بزم ادب'' کے نام سے ایک بزم بنائی گئی تھی جس کا مقصد اردو ادب کو فروغ دینا تھا۔ آنند لہر اس کے سرگرم رکن بھی رہے۔

آنند لہر نے جب افسانہ نگاری کی شروعات کی اس وقت ریاست جموں وکشمیر میں افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ان افسانہ نگاروں میں پشکر ناتھ، مالک رام آنند، ویدراہی، نور شاہ، خالد حسین، موہن یاور، کشوری چند، وریندر پٹواری، کشمیری لال ذاکر، عبدالغنی، پروفیسر ظہورالدین کے علاوہ کئی اور اہم نام ہیں۔ جنھوں نے ریاست میں اردو فکشن کو نئی سمت ورفتار عطا کی۔ اس طرح ریاست جموں وکشمیر میں نئی نسل کے فنکار بھی فکشن کے علاوہ دیگر اصناف شعر ونثر میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔

آنند لہر نے افسانوں کے علاوہ ناول اور ڈرامے بھی تخلیق کیے لیکن وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ آج تک ان کے پانچ افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں ہر انھوں نے ہر قسم کے افسانے تخلیق کیے ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''انحراف'' ہے، جس میں آنند لہر نے تجریدی، تمثیلی اور استعاراتی افسانے لکھے ہیں۔ اگرچہ یہ افسانے چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن ان افسانوں میں آنند لہر نے زندگی کے حقائق کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اردو افسانہ میں انتظار حسین، بلراج مین را اور سریندر پرکاش کے بعد آنند لہر نے علامتی اور تجریدی افسانے میں مثبت سمت اختیار کی ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں تجریدی اور علامتی افسانہ نگاروں میں آنند لہر کا نام سرفہرست ہے۔

اس کے علاوہ آنند لہر کے چار افسانوی مجموعے ہیں جن میں ''کورٹ مارشل''، ''سرحد کے اس پار''،

''بٹوارہ'' اور ''سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے'' شامل ہیں اور جن میں تقریباً ایک سو اڑتیس (138) افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں آنند لہر نے داستانوی قصے یا خیالی کہانیاں تحریر نہیں کی ہیں بلکہ موجودہ وقت کے سماجی و سیاسی حالات کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔

افسانوں کے علاوہ آنند لہر نے ناول بھی تحریر کیے ہیں۔ان کے پانچ ناول منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں ''اگلی عید سے پہلے''، ''سرحد کے بیچ''، ''مجھ سے کہا ہوتا''، ''یہی سچ ہے'' اور ''نامدیو'' قابل ذکر ہیں۔ ''اگلی عید سے پہلے'' ناول میں آنند لہر نے سرزمین کشمیر کی درد بھری داستان بیان کی ہے۔ ملک کے دیگر حصوں کی طرح ریاست جموں و کشمیر میں بھی پہلے سے ہی مسائل رہے ہیں جن کی وجہ سے وہاں کی عوام کا استحصال ہوتا رہا ہے لیکن ملک کی آزادی کے بعد وہاں کی سیاست نے ایک نیا رخ لیا جس کی وجہ سے ریاست ہمارے ملک کا ایک بہت بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے اور آج تک اس کا کوئی حل نہیں نکل سکا۔ آنند لہر نے اس ناول میں اگر چہ ایک ایسے حادثے سے متاثر لوگوں کی کہانی بیان کی ہے جن کو مجبوراً وطن چھوڑ کر ریاست و ملک کے دیگر حصوں میں پناہ لینی پڑی لیکن اس ناول میں آنند لہر نے نہ صرف حادثہ پیش کیا ہے بلکہ کشمیر کی تہذیب، روایت اور خاص طور سے وہاں کی صدیوں پرانی بھائی چارگی کو نہایت ہی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے اور وہاں کی عوام کے جذبات کو بھی بخوبی پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ان کو اپنے اصل وطن بلانے کی خواہش ظاہر کی ہے ___ ''وہ بھی اگلی عید'' سے پہلے۔ یعنی کہ مصنف نے ناول کے موضوع کا انتخاب شعوری طور پر کیا ہے اور کشمیر کے صدیوں کی صدیوں پرانی رواداری کی بازیافت کی امید ظاہر کی ہے۔

ناول ''سرحدوں کے بیچ'' میں آنند لہر نے ہندستان کی تقسیم اور سرحد کے دونوں طرف دونوں طرف رہنے والے لوگوں کے مسائل کا جائزہ لیا ہے جو لوگ سرحدوں کے قریب کے رہتے ہیں اگر چہ سیاسی طور پر ان کو الگ الگ ملکوں کا شہری مانا جاتا ہے لیکن ان کی زبان، تہذیب ایک ہی ہے۔ اس کے علاوہ سرحد قائم کرنے سے پہلے وہ لوگ ایک دوسرے سے مل کر رہتے تھے، ایک دوسرے کا سہارا تھے لیکن سرحد قائم ہونے کے بعد ان کو ایک دوسرے سے ملنے کے لیے اجازت نامہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ کئی لوگوں کے رشتے دار یہاں سے وہاں ہو گئے اور کئی لوگوں کو سرحد کے بارے میں جانکاری نہیں تھی اور اگر غلطی سے بھی کوئی سرحد پار کرتا تو اس کو

جاسوس سمجھ کر قید کر لیا جاتا ہے۔ایسی ہی ایک کہانی کو آنند لہر نے اس ناول میں پیش کیا ہے۔

آنند لہر نے اپنے فکشن کو علاقائی یا ریاستی مسائل تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ قومی اور بین الاقوامی مسائل کو بھی پیش کیا ہے۔ان کا ایک ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' جس میں انھوں نے اگر چہ امریکہ کے ہاتھوں عراق پر نازل ہونے والی تباہی کو پیش کیا ہے لیکن یہ آج کے دور میں ترقی یافتہ ملکوں کے علاوہ ترقی پذیر ممالک جو ایٹمی ہتھیار جمع کرنے کی دور میں لگے ہوئے ہیں اور جن کا نقصان نہ صرف انسانوں کو بلکہ دیگر جاندار بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں، کا جائزہ لیا ہے۔اس ناول کے کردار پرندے ہیں جن کی زبانی آنند لہر نے انسانی قدروں کے زوال کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ناول ''یہی سچ ہے'' جس میں آنند لہر نے انسانی زندگی کے حقائق کو فلسفیانہ انداز میں مختلف کرداروں کے ذریعے بڑے ہی مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ناول ''نامدیو'' جس کا بنیادی موضوع عشق ہے۔ نامدیو اور نعیما اس کے مرکزی کردار ہیں جو ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے ہیں لیکن نعیما کی شادی جبراً کسی دوسرے کے ساتھ کرائی جاتی ہے۔اس ناول میں آنند لہر نے محبت کے موضوع کو نہایت ہی پاکیزگی عطا کرتے ہوئے اس کے کرب و درد کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ہمارے سماج میں اس طرح کے واقعات اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

افسانے اور ناولوں کے علاوہ آنند لہر نے ڈرامے بھی تخلیق کیے ہیں۔ان کے تین ڈرامے ہیں جن میں ''تپسوی کون'' طویل ڈراما ہے، اس کے علاوہ ''سرحدیں'' ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں تین ڈرامے ''سرحدیں''، ''پل'' اور ''زندگی'' شامل ہیں۔''نروان'' ان کے ڈراموں کا تیسرا مجموعہ ہے جس میں ''تیاگ''، ''کالی کہانی''، ''کھیل''، ''نروان'' اور ''گناہگار'' شامل ہیں۔ان ڈراموں میں مختلف کرداروں کے ذریعے سماجی مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔

''تپسوی کون'' ایک طویل ڈراما ہے جسے تیرہ مناظر میں تقسیم کیا ہے۔جس میں ہمارے سماج میں رہنے والے مختلف قسم کے لوگوں کی نفسیات، عادات و خصائل کو بخوبی پیش کیا ہے۔یہ ایک دلچسپ ڈراما ہے۔

ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''سرحدیں'' میں شامل ڈرامے ''سرحدیں'' اور ''پل'' میں سرحد کو مسائل کو ڈرامائی

انداز میں پیش کیا ہے۔ڈراما ''زندگی'' میں آنند لہر نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔

آنند لہر نے اپنے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں موجودہ دور کے سماجی، سیاسی حالات کی عکاسی ہے۔ روزمرہ زندگی کے مختلف مسائل ان کے پیش نظر رہے ہیں جنھیں آنند لہر نے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ہجرت، سرحد اور عورت ان کے خاص موضوعات ہیں ان کے علاوہ بھی دیگر سماجی، سیاسی، تہذیبی موضوعات پر ان کو دسترس حاصل ہے جنھیں وہ اپنے فکشن میں پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے فکشن کے کردار اور موضوعات میں کہیں کہیں مماثلت پائی جاتی ہے لیکن اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ہمارے سماج میں اکثر واقعات وحادثات جن کے وجوہات اور نتائج تقریباً یکساں ہوتے ہیں، جن کی منظر کشی آنند لہر نے بہت ہی دلکش انداز میں کی ہے۔

آنند لہر نے علامتی، استعاراتی انداز اپناتے ہوئے عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔عصر حاضر میں ریاست جموں وکشمیر کے دیگر فکشن نگاروں کے طرح آنند لہر کا ایک نام ہے جس کا ثبوت ان کے افسانے، ناول اور ڈرامے ہیں جو عوام میں بیحد مقبول ہیں لیکن آنند لہر کی پہچان بحیثیت افسانہ نگار ہے۔ ریاست کے فنکاروں کے علاوہ ملک کے نامور ادیب وفنکاروں ونقادوں نے ان کی تخلیقات کو سراہا ہے۔ان کے تمام افسانے، ناول اور ڈرامے عصر حاضر کے سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔

☆☆☆

کتابیات

بنیادی مآخذ:

لہر، آنند، اگلی عید سے پہلے (ناول)، جموں: مانوی پرکاشن، 2002

لہر، آنند، انحراف (افسانوی مجموعہ)، دہلی: ملک بک ڈپو، 2002

لہر، آنند، بٹوارہ (افسانوی مجموعہ)، دہلی: اردو بک سوسائٹی، 2009

لہر، آنند، تپسوی کون (ڈراما)، نئی دہلی: ادارۂ فکر جدید، 1994

لہر، آنند، سرحد کے اس پار (افسانوی مجموعہ)، دہلی: سیمانت پرکاشن، 2001

لہر، آنند، سرحدوں کے بیچ (ناول)، دہلی: ملک بک ڈپو، 2002

لہر، آنند، سرحدیں (ریڈیائی ڈرامے)، کلکتہ: گلستان پبلی کیشنز، 2006

لہر، آنند، سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے (افسانوی مجموعہ)، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2015

لہر، آنند، کورٹ مارشل (افسانوی مجموعہ)، جموں: مانوی پرکاشن، 2006

لہر، آنند، مجھ سے کہا ہوتا (ناول)، نئی دہلی: اردو بک سوسائٹی، 2005

لہر، آنند، نامدیو (ناول)، دہلی: اوشان پبلی کیشنز، 2012

لہر، آنند، نروان (ڈرامائی مجموعہ)، جموں: جے کے بک ہاؤس، 1988

لہر، آنند، یہی سچ ہے (ناول)، دہلی: اردو بک سوسائٹی، 2008

ثانوی مآخذ:

پریمی، برج، جموں کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما: تنقید و تحقیق، کشمیر: دیپ پبلی کیشنز، 1992

کاشمیری، حامدی، ریاست جموں کشمیر میں اردو ادب، سری نگر: گلشن پبلی کیشنز، 1991

نارنگ، گوپی چند، اردو افسانہ روایت و مسائل، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1981

عظیم، وقار، داستان سے افسانے تک، علی گڑھ، مکتبہ الفاظ، 1987

عظیم، وقار، فن افسانہ نگاری، علی گڑھ، آفاق بک ہاؤس، 1969

سروری، عبدالقادر، کشمیر میں اردو (حصہ دوم)، سری نگر: اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، 1982

مرزا، صابر، جموں کے علاقائی ادب پر اردو کے اثرات، راجوری: انجمن پہاڑی ترقیاتی ادب، 2005

ملک، شہاب عنایت، ریاست جموں کشمیر کی وادی چناب میں اردو زبان وادب، جموں: قاسمی کتب خانہ، 2017

ملک، شہاب عنایت، جموں کشمیر میں اردو زبان ماضی، حال اور مستقبل، جموں: جموں یونیورسٹی، سینٹر فار پروفیشنل اسٹڈیز اِن اردو، 2010

اختر، محمد، اردو افسانے کی عملی تنقید، جدید اور مابعد جدید کے تناظر میں، دہلی: البلاغ پبلی کیشنز، 2016

نسیم، محمد، اردو ناول پر تقسیم ہند کے المیے کے اثرات، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2012

فاطمہ، تسنیم، جدید اردو افسانے کے چند اہم فنکار، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2014

اسلم، فوزیہ، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2009

آزاد، اسلم، اردو ناول آزادی کے بعد، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2014

جمشید پوری، اسلم، جدیدیت اور اردو افسانہ، دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 2001

وہاب، خان شاہد، اردو فکشن میں ہجرت، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005

رسائل و جرائد:

شیرازہ (ماہنامہ)، جموں کشمیر میں اردو افسانہ نمبر، جلد 52، شمارہ 12-11، 2016

شیرازہ (ماہنامہ)، ہم عصر افسانہ نمبر، جلد 51، شمارہ 3-1، 2016

تسلسل (ششماہی)، جموں: شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی، 15 جنوری تا 15 جولائی، 2005

آب جو (سہ ماہی)، جموں کشمیر: اردو نیشنل ڈیولپمنٹ سوسائٹی، کشتواڑ، جولائی 2005

HIJRAT, SARHAD AUR AURAT: ANAND LAHAR KE FICTION KA MUTALA

(Migration, Border and Women: A Study of Anand Lahar's Fiction)

Dissertation submitted to the Jawaharlal Nehru University
in partial fulfilment of the requirement for
the award of the Degree of

Master of Philosophy

Submitted by

Sushil Kumar

Under the Supervision of

Prof. Mazhar Hussain

(Mazhar Mehdi)

Centre for Indian Languages
School of Languages, Literature and Culture Studies
Jawaharlal Nehru University
New Delhi -110067

2017